فروری 2021

Rs. 30/-

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ

حیاتِ نو

دہلی

مڈل ایسٹ میں ملازمت کے خواہش مند حضرات کے لیے

ایک قابل اعتماد ادارہ

الهند فارن سروس ایجنسی

- اگر آپ میڈیکل لائن سے متعلق ہیں
- اگر آپ کوئی ہنر جانتے ہیں
- اگر آپ صرف پڑھے لکھے ہیں اور آپ کے پاس کوئی ہنر نہیں ہے
- اگر آپ کا کسی ہوٹل انڈسٹری سے تعلق ہے
- اگر آپ عام لیبر یا مزدور ہیں

تو آپ اپنے پاسپورٹ کی کاپی، فوٹو اور بائیو ڈاٹا ہمیں بھیج دیجئے......اور دیگر تفصیلات کے لیے ہماری اطلاع کا انتظار کیجئے۔

وكالة الهند للخدمات الأجنبية

AL-HIND FOREIGN SERVICE AGENCY

Registration No.: B-0376/DEL/PER/1000+/5/1263/1984

Head Off: No. 73, Main Road, Near SBI
Zakir Nagar, New Delhi-110 025 (India)
E-mail: info@al-hind.com

Ph : 0091 - 11 - 26983980, 26983981
0091 - 11 - 26988375 / 76
Fax : 0091 - 11 - 26983982

Web: www.al-hind.com

Branch Office: 38, G.F. Ashoka Shopping Complex, Near G.T. Hospital
L.T. Road, Mumbai - 400 001 (India)
Ph. : 0091-22-22652906 Fax: 0091 - 22 - 22652910

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو دہلی

مدیر مسئول : سید راشد حامدی مدیر اعزازی : ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

مدیر معاون : محمد اسعد فلاحی

جلد۔٦ ، شمارہ ۔ ٢ | فروری ٢٠٢١ء | رجب المرجب ١٤٤٢ھ

ادارتی امور کے لیے رابطہ کریں: 9927206518،8287025094 | انتظامی امور کے لیے رابطہ کریں: 7011838453

ای میل: jareedahayatenau@gmail.com

فی شمارہ	:	اندرون ملک	۳۰؍روپے
		بیرون ملک	۵؍امریکی ڈالر
خصوصی شمارہ	:		۱۰۰؍روپے
سالانہ زرتعاون	:	اندرون ملک	۳۰۰؍روپے
		بیرون ملک	۲۰؍امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	:	اندرون ملک	۵۰۰۰؍روپے
		بیرون ملک	۳۰۰؍امریکی ڈالر

مجلس ادارت

١۔ مولانا ظفر احمد اثری فلاحی، لندن
٢۔ ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی، علی گڑھ
٣۔ مولانا انعام اللہ فلاحی، دہلی
٤۔ مولانا عبدالبر اثری فلاحی، ممبئی
٥۔ مولانا انیس احمد فلاحی مدنی، جامعۃ الفلاح
٦۔ امتیاز وحید فلاحی، کولکاتا
٧۔ محمد انس فلاحی مدنی، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی

ہمارے نمائندے

١۔ رضوان احمد فلاحی، لندن
٢۔ موسیٰ کلیم فلاحی، متحدہ عرب امارات
٣۔ حسن حبیب فلاحی، نیپال
٤۔ فیاض احمد فلاحی، قطر
٥۔ محمد سموئیل فلاحی، کویت
٦۔ ڈاکٹر انعام اللہ فلاحی، سعودی عرب
٧۔ ذوالقرنین حیدر فلاحی، ملیشیا

★ رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگوانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

★ مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Hamdi ,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025.
Printed at: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Ziauddin Falahi**

نقوشِ حیات

اداریہ	ضیاء الدین ملک فلاحی	۴

قرآنیات

حاصل مطالعہ سورۂ بقرۃ	انتخاب عالم شمسی فلاحی	۸

اسلامی معاشرہ

عائلی نظامِ زندگی پر مغربی تہذیب وثقافت کے اثرات	محمد اسامہ فلاحی	۱۹

شخصیات

سید احمد شہیدؒ اور تحریک شہیدین	فواز جاوید خان	۳۵
دو ہم مزاج، عظیم اور رہ نما شخصیتیں	علامہ سلمان العودۃ	۵۲

طب یونانی

ضدی بخار اور اس کا شافی علاج	حکیم شاہد بدر فلاحی	۵۶

نقد و تبصرہ

استدراک	مولانا محمد عیسیٰ قاسمیؒ	۶۲
دین کا قرآنی تصور: ایک مطالعہ	محمد انس مدنی	۸۱
رسول اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین	محمد اسعد فلاحی	۸۸

جامعہ کے لیل و نہار	مصباح الباری فلاحی	۹۱

مقالہ نگاران

۱-ڈاکٹر انتخاب عالم شمسی فلاحی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ ماس کمیونیکیشن، سندیپ یونی ورسٹی، مدھوبنی، بہار

۲-ڈاکٹر محمد اسامہ فلاحی، گیسٹ فیکلٹی شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

۳-برہان احمد ندوی، فاؤنڈر الشفاء ہیلتھ کیئر پراوئیٹ لمیٹیڈ دہلی

۴-جناب فواز جاوید خان، متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۵-حکیم شاہد بدر فلاحی، البدر یونانی شفاخانہ، اعظم گڑھ، یوپی

۶-مولانا محمد عیسیٰؒ قاسمی، سابق ناظم جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ

۷-مولانا محمد انس فلاحی مدنی، رفیق ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۸-محمد اسعد فلاحی، مدیر معاون حیاتِ نو، کارکن مرکز جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

۹-مولانا مصباح الباری فلاحی، استاد جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

۱۰-ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، مدیر حیات نو، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو علی گڑھ

اداریہ

علم کا اسلامی تناظر

تناظر (Perspective) کی اہمیت افکار ونظریات میں کلیدی ہے۔تناظر سے عدم آ گہی یا اس سے دوری دونوں نقصان کا باعث ہیں۔تناظر کی دو بڑی تقسیم ہوسکتی ہے: ایک مادی اور دوسری روحانی۔یعنی ایک وہ فلسفہ جو صرف مشاہداتی، مادی اور حسی دنیا سے بحث کرتا ہے، جب کہ دوسرا تناظر مذہبی، اخلاقی اور روحانی دنیا کی بات کرتا ہے۔لیکن روحانی اور مابعدالطبیعیاتی دنیا کے ضمن میں بھی تین طرح کے تناظر پائے جاتے ہیں، جنھیں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م ۱۹۷۹ء) نے اپنی رجحان ساز کتاب 'تجدید واحیائے دین' میں جاہلیت خالصہ، جاہلیت مشرکانہ اور جاہلیت راہبانہ سے تعبیر کیا ہے۔پہلا تناظر اچانک حادثہ اور بے خدا کی سنسار جیسی غیر منطقی اصطلاحات کے ذریعہ غیبی مسائل حل کو کرنے کی کوشش کرتا ہے اور عقل ووجدان کو شافی جواب دینے سے قاصر رہتا ہے۔دوسرا تناظر خدا کے وجود کا اقراری ہے لیکن وحدانیت کا تصور اس کے لیے ناقابل تسلیم ہے۔جب کہ تیسرا تناظر اچانک حادثہ، بے خدا سنسار اور شریک خدا سب کا مخالف ہے لیکن اجتماعی زندگی اور زندگی کی جملہ ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے کتراتا ہے۔ان تینوں تناظر کے مقابلے میں اسلامی تناظر اپنی اہمیت، صداقت اور معنویت کو تسلیم کرانے کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے۔جس کا آغاز تخلیق کائنات کے وقت ہی سے ہوگیا تھا جب خالق کائنات نے کہا تھا کہ میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے جارہا ہوں جسے وہ علم دوں گا جو فرشتوں کو بھی نہیں عطا کیا گیا ہے۔

تخلیق آدم کے وقت علم کی عطا و بخشش کا صاف مطلب یہ تھا کہ خلافت ارضی کا تعلق علم سے ازلی وابدی ہوگا۔ اس علم کے ذریعہ خلیفہ اللہ کو طاقت ور اور بامقصد تہذیب تشکیل دینا ہے اور ایسی طاقت حاصل کرنا ہے جس کے ذریعہ منکرات ومفسدات کا ازالہ کیا جاسکے اور معروفات کا قیام ہوسکے۔یعنی دین کی اقامت ممکن بنائی جاسکے۔

علم کا یہی تناظر سورۃ العلق کی ابتدائی آیات میں نظر آتا ہے: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْأَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (العلق:۱۔۵) ''پڑھو اے نبیؐ! اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے، انسان کی تخلیق کی۔پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ

جانتا تھا‘‘، یعنی ایک نئی تہذیب کی بنیاد علم پر رکھی گئی ۔ اس میں تخلیق انسانیت کا فلسفہ واضح کیا گیا۔رب العالمین کی صفت رحیمیت عطا اور بخشش کا احساس دلایا گیا اور علم کے ایک ایسے حصے کا تذکرہ کیا گیا جسے انسان اپنے تخیلات ،مشاہدات اور تجربات کے ذریعہ حاصل نہیں کرسکتا!

اسلامی تناظر کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ افکار ونظریات میں توحید،رسالت اور آخرت کو گوندھ کر پیش کرتا ہے اور قلب وضمیر کی تمام الجھنیں ختم کرتا ہے۔ ہر فکر وفلسفہ، وجدان وتخیل جو ان تین عناصر سے خالی وعاری ہو وہ اسلامی تناظر سے بھی فارغ ہوگا۔افکار ونظریات کے مطالعہ وتحقیق میں اس پر توجہ ہونی چاہیے تا کہ نئی تحقیقات کا رخ متعین ہو سکے۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ علم کا اسلامی تناظر چند سوالات بھی قائم کرتا ہے اور قرآن وسنت کی روشنی میں ان کے جوابات پیش کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ خود علم کیا ہے؟علم کے موضوعات ومباحث کیا ہیں؟علم کے ماخذ ومصادر کیا ہیں؟ اور ان کی تصدیق اور معتبریت کے ذرائع کیا ہیں؟ علوم کی اقسام کون کون سی ہیں؟انسان کس علم سے اپنی قوت وشوکت میں اضافہ کرسکتا ہے اور اس علم سے وہ کیسی تحقیقات دنیا کے سامنے پیش کرسکتا ہے۔

چنانچہ علم کا سلامی تناظر علم کی ماہیت کی بابت بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کائنات کے وقت حضرت آدمؑ کو دنیا میں رہنے بسنے ،اسے برتنے اور اس میں خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی تمام صلاحیتیں ودیعت کردیں،اسے علم اشیاء عطا کیا۔ **علّم آدم الاسماء کلھا** کے ذریعہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ نالج کسے کہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے خلیفہ کی نظر اپنے وقت کے افکار ونظریات پر ناقدانہ ہونا چاہیے۔یعنی یہ کہ ابن آدم اپنے وقت کے علم اسما کا عارف ومعرّف ہوتا ہے۔اس آیت سے علم کی یہ ماہیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس کی عطا وبخشش خالق کائنات کی طرف سے ہوتی ہے اور اللہ کا خلیفہ اس میں اپنی عقل وحکمت کا استعمال کرکے اسے خادم انسانیت بناتا ہے اور اخروی نجات کے لیے اسے استعمال کرتا ہے۔ وہ کبر وگھمنڈ سے دور رہتا ہے وہ شکر گزار اور نعمتوں کا گن گانے والا اور ہمہ جہت وہمہ آن مطیع ومنقاد ہوتا ہے۔

علم کا اسلامی تناظر انسان کی تخلیق ، خالق سے اس کے تعلق ، دیگر مخلوقات کے تئیں اس کے فرائض کی تعیین کرتا ہے۔یعنی وہ ان بڑے سوالات میں انسانی عقل کو جوابات عطا کرتا ہے جن کے حصول کے لیے دنیا کے بڑے بڑے فلاسفہ، متکلمین اور مفکرین نے اپنی زندگیاں کھپادیں اور جوابات اور فلسفے عطا کیے وہ بھی ان سوالات کا شافی حل تلاش نہیں کرسکے۔اسلام تناظر علم کے ذرائع میں قرآن اور رسالت محمدیﷺ کو اولیت دیتا ہے۔قرآن کو وہ **ھُدیً للنّاس** ،**ھُدیً لِلْمُتَّقِین** کہتا ہے۔جن کی ایک خوبی **یومنون بالغیب** کو قرار

دیتا ہے۔ مشاہدہ، تجربہ اور واہمہ پر مبنی جن تناظر نے جو بھی پیش قدمیاں کیں وہ قعرِ مذلت میں گرے۔ ان تناظر کے واضعین نے پوری زندگیاں خرچ کیں لیکن یا تو انہوں نے غیبی دنیاؤں کا سرے سے انکار کیا یا تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے۔ اسلامی تناظر نے پیغمبر اسلام کو علم کا دوسرا حقیقی ماخذ قرار دیا اور غیبی دنیاؤں کی تعبیر وتشریح اس طرح قوی اور محکم دلائل سے کی کہ گویا وہ مشاہداتی دنیا بن گئی۔

علم کا تحقیقی تناظر بھی نہایت اہم ہے، جیسا کہ ذکر ہوا کہ اللہ کے خلیفہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاصر افکار ونظریات کا بنظر غائر مطالعہ کرتا ہے اور خذ ما صفا و دع الکدر کے بہ مصداق معاملہ کرتا ہے۔ چنانچہ یونانی علوم وافکار کی بابت یہ بات معلوم ہے کہ وہ واہموں اور تخیلات پر مبنی ہیں اور یہ واہمے اور تخیلات ہمیشہ اختلاف وانتشار اور بے ربطی کا شکار رہے ہیں۔ یونانی فلاسفہ کے درمیان خود بڑے بڑے سوالات کے تعلق سے تضاد اور اختلاف ہے۔ دوسری جانب دور جدید میں مغربی تہذیب نے مشاہدہ وتجربہ کی بنیاد پر جو سائنسی علوم دنیا کو عطا کیے وہ بھی اپنے اندر توازن، صداقت، تسلسل اور انتشار سے محفوظ نہیں ہیں۔ ایک ہی دور میں مغربی علماء اور دانش وروں کے درمیان ایک سے زائد فلسفے اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ یونانی علوم کا ماہر ارسطو اور مغربی فلسفہ کا معروف اسکالر گلیلیو اپنی تحقیقات میں درماندہ نظر آتے ہیں۔ علم کا اسلامی تناظر مشاہدہ اور عقل کی ماہیت کے ساتھ دونوں کی درماندگی کو ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ سمع، بصر اور فواد (بنی اسرائیل: ۳۶) کی تینوں قوتوں سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے۔ لیکن تینوں کی کم مائیگی کی بھی وضاحت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ مابعد الطبیعیاتی دنیا ایک اٹل حقیقت ہے جس کا ادراک وعرفان لازمی ہے اور قرآن اور رسول پر ایمان کے بغیر ممکن بھی نہیں ہے۔ سید ابوالاعلی مودودی نے اپنے مضمون 'علمی تحقیقات کیوں اور کس لیے' میں عقیدے کو اسلامی تناظر میں علمی تحقیقات کے لیے کلیدی قرار دیا ہے۔ وہ قوموں کو علمی تحقیقات کے ذریعہ جمود وانحطاط سے نکالتے ہیں۔ راقم السطور نے علم کے اسلامی تناظر کو تعلیم وتحقیق سے اپنے ایک مقالے میں دیکھنے کی کوشش کی تھی جس کا عنوان ہے: 'تعلیم وتحقیق سے تقویٰ کا لزوم' (حیات نو جنوری ۲۰۱۹ء) اس مضمون میں سید مودودی کے حوالے سے وارثین انبیا کے لیے تین ذمہ داریوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اول: مغربی فکر اور مغربی فلسفۂ حیات کا جو طلسم بُنا گیا اس کو توڑا جائے، دوم یہ کہ سماجی علوم وفنون کو نئے اسلوب اور نئے طریقے پر مرتب کیا جائے تاکہ وہ اسلامی تہذیب کی بنیاد بن سکیں اور سوم یہ کہ جدید نصاب کی ترتیب وتشکیل کا کام مکمل کیا جائے۔ سید مودودی نے اسلام مائزیشن آف نالج کی اسی بحث کو اپنے چند مقالات میں پیش کیا ہے جو

تعلیمات نامی کتابچے کا حصہ ہیں۔ حالیہ برسوں میں IIIT لندن میں جن اسکالرز نے نفس مسئلہ پر داد تحقیق پیش کی ہے ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی کا ہے۔

تحقیق وریسرچ کو اسلامی تناظر میں پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ علم کا تعلق تزکیہ سے مضبوط اور مربوط کیا جائے۔ جب ہی وہ ھدیً للمتقین بن سکے گا۔ قرآن نے واضح طور پر نبی کریم ﷺ کی چار ذمہ داریاں گنائی ہیں۔ وہ اللہ کی آیات و برہان کو سناتا ہے۔ اہل ایمان کا تزکیہ کرتا ہے۔ کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس نبوی مشن میں تعلیم کی تکرار اور اسے تزکیہ کے گلدستے میں پیش کرنا، تعلیم وتدریس کا اسلامی تناظر واضح کرنا ہے۔ پروفیسر خورشید احمد نے اپنے مقالے 'اسلام کا نظریہ تعلیم' میں اس مسئلے کی دل نشین وضاحت کی ہے اور جسے پروفیسر محمد رفعت نے زندگی نو کے متعدد اداریوں میں مزید نکھارا ہے۔

علم کے اسلامی تناظر کی بحث میں علم کی تفہیم کے مسئلہ پر عہد وسطیٰ سے آج تک بحث ونظر جاری ہے۔ علم فرض کفایہ وغیر کفایہ، علوم عالیہ وآلیہ یا دینی ودنیاوی علوم جیسی اصطلاحات آج تک رائج وشائع ہیں۔ حدیث نبوی میں علم نافع کی اصطلاح نے اور خیر کم من ینفع الناس جیسی اعلیٰ قدروں نے علم کا صاف وشفاف اور دل نشیں تناظر پیش کیا ہے۔ اس تناظر سے علم کی وحدت وہم آہنگی قائم ہوگی۔ انفرادیت اور اجتماعیت کے اندر توازن قائم ہوگا۔ تعمیر کردار ہوگا، اخلاقیات کی بازیافت ہوگی اور تکمیل حیات ہوگی۔

وارثین انبیاء اور اسلامی اسکالرز کی ذمہ داری ہے کہ علم کے اس بیانیے کو عام کریں۔ پوری جرأت کے ساتھ علم کے صرف دو خانے اور خاکے بنائیں۔ یعنی علم نافع اور علم غیر نافع۔ اسی تناظر کے ذریعہ تزکیہ، تعلیم، شکر اور فکر کا آپسی رابطہ استوار ہوگا اور یہی علم کا حقیقی تناظر کہلائے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

> اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیَاماً وَّقُعُوۡداً وَّعَلٰی جُنُوۡبِھِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمَاوَاتِ وَالۡأَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ھَذا بَاطِلاً (آل عمران:۱۹۱)
>
> ''جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اور زمین وآسمانوں کی ساخت میں غور کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں:) پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔''

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
۱۹ر فروری ۲۰۲۱ء۔ ۶ر رجب المرجب ۱۴۴۲ھ

●▢●

حاصل مطالعہ سورۂ البقرۃ۔ نظم قرآن کے پہلو سے

(آیت ۱۷ تا ۲۵)

انتخاب عالم شمسی

سورۂ بقرہ کتاب وشریعت کی سورہ ہے۔ جس میں امت مسلمہ کو بنیادی سماجی ومعاشرتی احکام دیے گئے ہیں۔ پچھلی امت مسلمہ بنی اسرائیل کو معزول کرکے نئی امت مسلمہ کو ملت ابراہیمی کی بنیادوں پر قائم کیا گیا اور اسے شہادت علی الناس کے منصب پر فائز کیا گیا۔

آدمؑ کو خلافت سونپے جانے کے واقعہ کو کتاب وشریعت کی تمہید کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا کہ کتاب وشریعت کا عطا کیا جانا اسی خلافت فی الارض کا لازمی نتیجہ ہے۔

لیکن اس تمہید سے پہلے تین گروہوں کی تصاویر پیش کی گئیں، جو اس کتاب شریعت کے نزول کے نتیجے میں پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں پہلی تصویر اس کتاب کو قبول کرنے والوں کی تھی۔ اس گروہ کی بنیادی صفات بتائی گئیں جب کہ دو تصاویر اس کتاب کی مخالفت کرنے والے گروہوں کی پیش کی گئیں۔

اس سے قبل اس کتاب کی مخالفت کرنے والے دونوں گروہوں کی تفصیلات متعلقہ آیات کے تحت بیان کی گئی تھیں۔ ان میں پہلا گروہ مختوم القلوب لوگوں کا تھا جن کے جرائم کی پاداش میں ان پر ہدایت کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ انہیں کے بارے میں فرمایا گیا کہ ان کے لیے برابر ہے کہ تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ جب کہ دوسرا گروہ منافقین کا تھا جو کہ اسلام کے مستقبل سے متعلق شکوک وشبہات میں مبتلا تھا۔ یہ وہ گروہ تھا جس نے بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا لیکن ان کے تعلقات اسلام دشمن عناصر سے بہت گہرے تھے۔ بلکہ اسلام کو نقصان پہنچانے کے سلسلے میں یہ انہی کے آلہ کار بنے ہوئے تھے۔ اس گروہ کی تفصیلات قرآن مجید میں پہلے بیان کیے گئے دو گروہوں کی بہ نسبت قدرے تفصیل سے بیان کی گئی تھی۔

اب آگے اسی اسلام مخالف دونوں گروہوں کی تمثیل بیان ہوئی ہے۔ تمثیل کا سلوب نہایت اعلیٰ ہے اور یہ قرآن کی فصاحت وبلاغت کا شاہ کار بھی ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَاراً فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لاَّ يُبْصِرُونَ (۱۷)

''ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی تو جب اس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کرلیا اورانہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔''

مَثَلُهُمْ: هُم کا مرجع اس سے پہلے بیان کیے گیے دونوں گروہ ہیں جو کہ اسلام کی مخالفت کر رہے تھے۔

چوں کہ اس سے پہلے منافقین کی جماعت کا ذکر قدرے تفصیل سے گزرا ہے اس لیے متقدمین میں زیادہ تر نے اس سے مراد منافقین کی جماعت کو لیا ہے اور چوں کہ یہاں دو تمثیل بیان ہوئی ہیں اس لیے انہوں نے منافقین کی دو جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔

لیکن الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دراصل اسلام کی مخالفت کر رہے دونوں گروہ مراد ہیں جن میں ایک گروہ مختوم القلوب کا تھا اور دوسرا منافقین کا۔متاخرین میں استاذ امین احسن اصلاحی ،سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ڈاکٹر اسرار احمد کی یہی رائے ہے۔

یہاں دو تمثیلیں بیان ہوئی ہیں۔ان میں پہلی تمثیل مختوم القلوب گروہ کی ہے جن کا ذکر آیت ۶ میں إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُواْ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لاَ يُؤْمِنُونَ کے الفاظ سے ہوا۔

تمثیل میں ایک قافلہ کی منظر کشی کی گئی ہے۔جو اندھیری اور ٹھنڈی رات میں کسی بیابان میں سفر کر رہا ہے۔ ایسے میں اندھیرا دور کرنے کے لیے قافلہ کے ایک شخص نے آگ جلائی۔تو جب اس آگ نے گرد و پیش کو پوری طرح سے روشن کر دیا تو اللہ نے اس روشنی کی قدر نہ کرنے کے پاداش میں اس قافلہ کے لوگوں کی آنکھوں کی روشنی سلب کر لی اور انہیں اندھیرے میں چھوڑ دیا کہ انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔(۱)

یعنی آگ تو ابھی بھی جل رہی ہے اور روشنی ابھی بھی موجود ہے لیکن اب ان کے دیکھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے،اس لیے اس روشنی کا کوئی فائدہ انہیں حاصل نہیں ہو پا رہا ہے۔

الَّذِىْ اسْتَوْقَدَ نَاراً سے آپ ﷺ کی ذات اقدس کو مراد لیا جا سکتا ہے اور جن لوگوں کی نور بصارت سلب ہو گئی اس سے وہ لوگ مراد ہوں گے جنہوں نے آپؐ کی لائی ہوئی ہدایت کی ناقدری کی۔جنہوں نے اللہ کی توفیق سے ہدایت کی شمع روشن کی اور غرور و گھمنڈ میں مبتلا رہے۔چوں کہ خصوصی خطاب یہود سے ہے اس

لیے یہود کا وہ گروہ خاص طور پر مراد ہوگا جنہوں نے حسد اور گھمنڈ کی بنا پر حق واضح ہونے کے باوجود آپ ؐ کی مخالفت کی، جس کی وجہ سے سنت الٰہی کے مطابق ان کے ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہوگئی۔

استاذ امین احسن اصلاحیؒ نے الذی استوقد نارا سے حضرت موسیٰؑ کو مراد لیا ہے۔ اس صورت میں یہ تمثیل بہت زیادہ بلیغ ہوجاتی ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کتاب شریعت کا آغاز ہوا جس کی تکمیل آپ ؐ کے ذریعہ ہوئی۔ اس صورت میں فَلَمَّا أَضَاءتْ مَا حَوْلَهُ سے شریعت کی تکمیل مراد ہوگی جو آپ ؐ کے ذریعہ ہوئی۔

یعنی عین اس وقت جب کہ روشنی گرد و پیش کو روشن کر چکی ہے شریعت مکمل ہوچکی ہے ان محروموں کی نور بصارت سلب کر لی جاتی ہے کیوں کہ یہ لوگ شروع سے ہی اس روشنی کی ناقدری کرتے آرہے ہیں۔(۲)

واضح رہے کہ بین السطور میں شروع ہی سے اس سورت میں خطاب بنی اسرائیل سے ہے جس کی وضاحت ہوچکی ہے۔

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لاَ يَرْجِعُونَ (۱۸)

''وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں تو اب وہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔''

یعنی اب نور بصارت چلے جانے کے ساتھ ساتھ ان کے سننے اور دیکھنے کی صلاحیت بھی ختم ہوگئی ہے۔ یعنی ہدایت سے پوری طرح محروم ہو چکے ہیں اور راہ پانے کی امید پوری طرح سے ختم ہوچکی ہے۔

یہ آیت آیت نمبر ۷ (**ختم الله علی قلوبهم وعلی سمعهم وعلی ابصارهم غشاوة**) سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تمثیل اسی مختوم القلوب گروہ کی ہے۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّهُ مُحِيطٌ بِالْكافِرِينَ (۱۹)

''یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو جیسے آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہو۔ جس میں تاریکی ہو اور کڑک ہو اور چمک ہو۔ یہ بجلی کے کڑکے سن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ ان منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔''

اب یہ ایک اور تمثیل بیان فرمائی گئی ہے جو کہ منافقین کے گروہ کی ہے یہ تمثیل بھی ایک قافلہ کی ہے جو کہ زوردار بارش میں پھنس گیا ہے۔ تمثیل میں اس گروہ کی حیرانی و پریشانی کی بہترین عکاسی کی گئی ہے اور اس گروہ کے شکوک وشبہات کی بیماری کو نہایت اعلیٰ اسلوب میں بیان فرمایا گیا ہے۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ: صیب کے معنی زوردار بارش کے ہیں اور اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ صاحب تدبر لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں دیگر مقامات میں بھی قرآن کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے۔(۳)

المراد من الصیب ھو الایمان والقرآن(۴)

مِنَ السَّمَآء: سماء کے معنی آسمان کے ہیں۔ مفسرین نے اس کے معنی بادل کے لیے ہیں۔ **قیل المراد من السماء السحاب۔(۵)**

جو چیز بھی ہمارے سروں سے اوپر فضا میں ہے وہ آسمان ہی کہلاتی ہے۔ **السماء کل ماعلاک ومافلک۔(۶)**

صاحب تدبر لکھتے ہیں:

بارش اگرچہ آسمان ہی سے ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ سما کا اضافہ بظاہر کچھ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس اضافے سے ایک تو بارش کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اور اس تصویر کی تمثیل میں بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ دوسرے اس سے قرآن کے آسمانی ہونے کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ ہو رہا ہے۔ کیوں کہ مراد اس بارش سے قرآن ہی ہے۔(۷)

فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ: جس میں تاریکیاں ہوں اور کڑک اور چمک ہو۔

فیہ کا مرجع صیب یعنی بارش ہے اور اس کے متعلق یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔

فِيهِ ظُلُمَاتٌ: جس میں تاریکی ہو۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب صیب سے مراد قرآن مجید ہے تو قرآن مجید میں کسی تاریکی کی موجودگی کا کیا سوال، بلکہ قرآن تو تاریکیوں کو ختم کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں منافقین کے دل کی کیفیت کا بیان ہے۔ جو کیفیت نزول قرآن اور اس کے نتیجہ میں پیدا شدہ حالات سے ان کے دلوں پر مرتب ہو رہے ہیں۔ یہ کیفیت دراصل ان کے نفاق کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے، جب کہ اہل ایمان کے دلوں کی کیفیت اس سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔

سورۃ احزاب میں ہے کہ جب جنگ خندق کے موقع پر منافقین نے دس ہزار کا لشکر مقابلہ کے لیے تیار دیکھا تو کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسول کے وعدے محض فریب تھے۔

وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُوراً(الاحزاب:۱۲)

''یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہیں تھے۔''

جب کہ اہل ایمان کے لیے یہ منظر ان کے ایمان میں زیادتی کا باعث بنا۔

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَاناً وَتَسْلِيماً. (الاحزاب:۲۲)

''اور سچے مومنوں (حال اس وقت یہ تھا کہ) جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔''

اس لحاظ سے ظلمت سے مراد وہ آزمائشیں ہیں جو اس وقت درپیش تھیں اور یہ چیز منافقین کے دلوں میں تاریکی، خوف اور شک وشبہات کا سبب بن رہی تھیں۔

ایک دوسرا قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد وہ پابندیاں ہیں جو قبول اسلام کے بعد منافقین پر بھی عائد ہو رہی تھیں اور ان کے دلوں پر شاق گزر رہی تھیں۔ مثلاً قیام صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، فریضۂ جہاد، ترک اماوت قدیم اور اطاعت رسول وغیرہ۔ (۸)

آج بھی بہتیرے لوگ ایسے ہیں جو اسلام کی عظمت کے قائل ہیں لیکن اس کے حدود وقیود کی وجہ سے اس کو اپنانے کا حوصلہ نہیں کر پا رہے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے کلمہ کا اقرار تو کر لیا لیکن یہی حدود وقیود ان کے لیے وجہ آزمائش بن جاتے ہیں۔

اس سے اس وقت کے غیر یقینی حالات مراد ہیں۔ چیلنجز سے بھری راہ میں اسلام کے روشن مستقبل کی امیدیں بھی تھیں اور اس بارے میں قرآن مجید کی یقین دہانیاں بھی موجود تھیں اور منکرین کے لیے قرآن کی وعیدیں بھی تھیں۔

يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِيْ آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ: وہ کڑکے سے بچنے کے لیے موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے دے رہے ہیں۔

من الصواعق ای من بیان القرآن وعده ووعیده (۹)

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاء لَهُم مَّشَوْاْ فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُواْ وَلَوْ شَاء اللّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّه عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۰)

''بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی ہے جب جب وہ چمکتی ہے۔ یہ چل پڑے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے رک جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھوں کو سلب کر لیتا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

یعنی اس وقت کی غیر یقینی جنگی صورت حال اور قرآن مجید کی وعدو وعید سے حیران و پریشان تھے اور ایسا لگ رہا تھا گویا اسلام کی روشنی نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔

جب جب روشنی ہوتی تو وہ اس میں چل لیتے اور جب اندھیرا چھا جاتا تو پھر کھڑے ہو جاتے۔ یعنی حالات اگر موافق ہوتے تب تو بڑے تیس مار خاں بنتے لیکن جیسے ہی کوئی آزمائش پیش آ جاتی تو اپنی جگہ پر ٹھٹھک جاتے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَذَھَبَ بِسَمْعِھِمْ وَأَبْصَارِھِمْ إِنَّ اللہَ عَلَی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ یعنی اگر اللہ چاہتا تو ان کو بھی نور بصیرت سے محروم کر دیتا۔ اور پہلے گروہ کی طرح ان کے دل پر بھی مہر لگا دیتا لیکن ابھی اللہ رب العزت نے انہیں حیات دے رکھی ہے جس کا انہیں شکر گزار ہونا چاہیے اور جلد از جلد اپنی اصلاح کر لینی چاہیے۔

یَا أَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُواْ رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِن قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُونَ(۲۱)

''اے لوگو! بندگی کرو اپنے اس رب کی جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے پہلے والوں کو بھی پیدا کیا تاکہ تم اللہ کے غضب سے بچو۔''

تینوں گروہوں کے ذکر کے بعد اب یہ تمام بنی نوع انسانی سے خطاب ہے۔ اور قران مجید کی اس دعوت کا بیان ہے جس کو قرآن ان کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ نہایت ہی دل نشیں اور دل نواز انداز میں مخاطب کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ وہ دعوت ہے جو عقل سلیم اور فطرت سلیم کی پکار ہے اور ہر گروہ، ہر طبقہ اور ہر فرد کے دل کی آواز ہے جس میں کسی اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یعنی اس دعوت کو لے کر مختلف گروہوں میں بٹنے پر ملامت ہے اور نہایت پر سوز انداز میں اپنے اصل کی طرف لوٹنے کی دعوت ہے۔

اُعْبُدُواْ رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِن قَبْلِکُمْ : بندگی اس کی جو مالک ہے پالنے والا ہے۔ یہی عقل و فطرت دونوں کا تقاضا ہے اور یہ کہ نہ صرف مالک ہے پالنے والا ہے بلکہ وہی ہے جس نے تن تنہا پیدا کیا ہے تو جب نہ خلقت میں کوئی دوسرا اس کا شریک ہے اور نہ ہی ربوبیت میں تو عبادت بھی صرف اور

صرف اسی کی ہونی چاہیے۔ یہی دین اسلام اور قرآن کی بنیادی تعلیم ہے۔

وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ: انسان کی اپنے آباو اجداد سے محبت اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ آباو اجداد سے جہاں محبت اور لگاؤ کا رشتہ ہوتا ہے وہیں عظمت کا ایک تعلق بھی قائم ہوتا ہے، اسی لیے فرمایا کہ تمہارے باپ داداؤں کا بھی رب ہے خالق و مالک ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ الفاظ لاکر یہ بتادیا گیا کہ توحید کا درس حال اور ماضی دونوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ربکم یعنی زمانہ حال میں بھی وہی تمہارا رب ہے اور والذین من قبلکم یعنی زمانہ ماضی میں بھی وہی تمہارے باپ داداؤں کا رب رہا ہے۔(۱۰)

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ: تا کہ تم اللہ کے غضب سے بچ جاؤ۔

لعل عربی میں امید و آرزو کے لیے آتا ہے لیکن قرآن مجید میں نتیجہ بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ ھی کلمة رجاء و شک و قد جائت فی القرآن بمعنی کَی۔(۱۱)

تتقون کا مفعول بہ محذوف ہے یعنی اللہ کے غضب سے بچو۔

الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الأَرْضَ فِرَاشاً وَالسَّمَآءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ فَلاَ تَجْعَلُواْ لِلّهِ أَندَاداً وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (۲۲)

''وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو چھت بنایا اور اتارا آسمان سے پانی تو اس سے نکالا تمہارے لیے پھلوں سے رزق تو تم اللہ کے شریک نہ بناؤ درآں حالیکہ تم جانتے ہو۔''

اس سے پہلے والی آیت میں بندگیِ رب کی جو دعوت دی گئی تھی اب اسی رب کی ربوبیت کی وضاحت کی جارہی ہے۔

انسان کی دو بنیادی ضرورتیں ہیں۔ ایک خطرات سے حفاظت کا سامان اور دوسرا سامان رزق۔ اس آیت میں ان دونوں کا بیان ہے۔

الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الأَرْضَ فِرَاشاً وَالسَّمَآءَ بِنَآءً: زمین انسان کے لیے بطور فرش کام کرتی ہے اور بلند و بالا آسمان ساری کائنات کے لیے ایک محفوظ چھت کے کام کرتا ہے اور یہ دونوں مل کر ایک گہوارے کی شکل بناتے ہیں۔ جس طرح گہوارے میں بچہ محفوظ و مامون ہوتا ہے اسی طرح ہماری حفاظت کے لیے رب العزت نے زمین و آسمان بنائے۔

وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً : بارش کے آسمان سے نازل ہونے میں جہاں خدا کی ربوبیت کا پہلو ہے وہیں یہ خدا کی وحدانیت کی بھی دلیل ہے اور یہ چیز بتاتی ہے کہ آسمان وزمین دونوں میں ایک ہی خدا کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر آسمان وزمین کے خدا الگ الگ ہوتے تو یہ نظام ہیں تو آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے اور زمین کے سبزے لہلہا اٹھتے یں۔ دیکھنے کو نہیں مل سکتا تھا۔

فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ : خطرات سے حفاظت اور امن وامان کی فراہمی کو بیان کرنے کے بعد اب یہ کمال رزق وفضل کا بیان ہے۔ اللہ رب العزت سے سامان رزق میں گونا گونیت عطا فرمائی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بقدر ضرورت دیا ہے بلکہ کمال جود وکرم کا مظاہرہ فرمایا ہے۔

فَلاَ تَجْعَلُواْ لِلّهِ أَندَاداً وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ : تو نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک درآں حالیکہ تم اسے جانتے ہو۔

وانتم تعلمون انه صانع هذه الاشياء (ابن عباس) انكم لكمال عقولكم تعلمون هذه الاشياء لايصح جعلها انداداً لله تعالىٰ (کبیر)(۱۲)

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُواْ بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُواْ شُهَدَآءَكُم مِّن دُونِ اللّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲۳)

> ''اور اگر تم اس کتاب کے بارے میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت تم بھی بنالاؤ اور اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے مقابلہ میں بلالو اگر تم سچے ہو۔''

قرآن کی بنیادی تعلیم توحید کے بعد اب یہ رسالت کا بیان ہے اور اس کی صداقت واضح کی جارہی ہے۔ اس کے بعد آخرت کا بیان آئے گا۔

یعنی اگر تمہیں اس دعوت توحید اور قرآن کے نزول من اللہ ہونے کے بارے میں شک ہے تو اس کا فیصلہ نہایت آسانی سے ہوسکتا ہے کہ تم بھی قرآن جیسی کوئی ایک سورت پیش کردو۔ اس سے محمد ﷺ کا قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ آپ سے آپ ختم ہوجائے گا۔

مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا : جو ہم نے نازل کیا اپنے بندے پر، ظاہر ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے لیکن اگر سیاق کا اعتبار کریں تو اس سے مراد خاص طور پر وہ آیتیں اور احکام ہوتی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یعنی صرف خدائے واحد کی بندگی کی دعوت۔ اسی دعوت توحید کو اوپر کی آیتوں میں عقل وفطرت کی

بنیاد پر بھی واضح کیا گیا تھا۔

وَادْعُواْ شُهَدَآءَ كُم مِّن دُونِ اللّهِ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ :اور اگر اکیلے یہ کام مشکل ہورہا ہے تو اپنے مددگاروں کو بھی بلالو اللہ کو چھوڑ کر، تمہارے پاس شاعر بھی ہیں، خطیب بھی ہیں، کاہن ونجومی بھی ہیں اور تمہارے معبودان بھی جن کی خدائی کو قرآن کے نزول کے بعد سب سے زیادہ خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ تو ایسے نازک وقت میں انہیں تمہاری مدد ضرور کرنی چاہیے۔(۱۳)

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ وَلَن تَفْعَلُواْ فَاتَّقُواْ النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (۲۴)

''تو اگر تم یہ سب نہ کرسکو اور تم ہرگز یہ نہ کرسکو گے تو بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے جو تیار ہے کافرین کے لیے۔''

یعنی ان سب کے باوجود اگر تمہاری مشکل حل نہ ہو پائے تو تمہیں تسلیم کرلینا چاہیے کہ یہ کلام اور یہ دعوت اللہ کی جانب سے ہے۔ کیوں کہ اسی پر تمہاری نجات منحصر ہے اور اسی کو قبول کرکے تم اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچا سکتے ہو۔

قرآن کی اس تحدی کے مختلف پہلو ہیں۔ مطالب کی جامعیت، مضامین واسلوب کلام کی ندرت اور معانی کی بلندی سب اس میں داخل ہے۔ اعجاز القرآن کا بڑا پہلو نظم قرآن بھی ہے۔ قرآن مجید کا اصلی اعجاز نظم قرآن ہی سے سامنے آتا ہے اور معانی کے وہ پہلو بے نقاب ہوتے ہیں جو بغیر نظم کو سمجھے نہیں ہوسکتے۔

یہاں زیر نظر آیتوں سے پہلے کی آیتوں میں قرآن مجید کی بنیادی تعلیم توحید کو عقل وفطرت کی بنیاد پر واضح کیا گیا ہے اور آفاق وانفس سے دلائل دیے گئے۔ قرآن مجید میں زیادہ تر دلائل عقل وفطرت کو بنیاد بنا کر آفاق وانفس اور تاریخ سے دیے گئے ہیں۔ حسی معجزات کو بطور دلیل پیش کرنے سے پرہیز کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں زیر نظر آیت میں قرآنی دعوت کو کسی حد تک حسی دلیل سے ثابت کیا گیا ہے۔

حسی دلائل میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص وقت تک ہی محدود ہوتی ہے لیکن یہاں جس حسی دلیل کا استعمال کیا گیا ہے اسے قیامت تک محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ بھی اعجاز قرآن کا ایک بڑا پہلو ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِين آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُواْ مِنْهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزْقاً قَالُواْ هَـذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِن قَبْلُ وَأُتُواْ بِهِ

مُتَشَابِهاً وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲۵)

''اوران لوگوں کوخوش خبری سنا دیجیے جوایمان لائے اورانہوں نے نیک اعمال کیے کہ ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی انہیں جب کوئی پھل کھانے کودیا جائے گا تووہ بول اٹھیں گے کہ یہ تو وہی ہے جوہمیں (اس کے) قبل مل چکا ہے۔اورانہیں ملے گا اس سے ملتا جلتااوران کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

مقابلہ کے اصول کے مطابق اب منکرین کے مقابلے میں مومنین کا اجر بیان ہورہا ہے۔

كُلَّمَا رُزِقُواْ مِنْهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزْقاً قَالُواْ هَـذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِن قَبْلُ: آخرت کے رزق کی دنیا کے رزق سے مشابہت اس وجہ سے بھی ہوسکتی ہے کہ انسان اسے دیکھ کر اجنبیت نہ محسوس کرے بلکہ اسے دیکھ کر رغبت والتفات محسوس کرے۔

مِــن قَبْــلُ: اس سے مراد دنیا کی نعمتیں بھی ہوسکتی ہیں اوراس سے پہلے جنت میں ملنے والی نعمتیں بھی۔یعنی جنت میں ملنے والی نعمتیں۔اہل تاویل سے دونوں طرح کے اقوال منقول ہیں۔استاذ محترم مولانا عنایت اللہ سبحانی مدظلہ نے دوران تدریس اس رائے کا اظہار فرمایا کہ جب جنت میں اہل جنت کی ضیافت کا اہتمام کیا جائے گا تو وہ اس کی شان دیکھ کر پکار اٹھیں گے کہ ھـذاالـذی رزقنا من قبل اسی شان کی ضیافت اس سے پہلے بھی ہماری ہوچکی ہے۔یعنی جنت میں ضیافت کی شان کبھی ماند نہیں پڑے گی، بلکہ پہلے پہل والی ضیافت کے آن اورشان موجود رہے گی۔

واضح رہے کہ عربی میں ثمرۃ سے مراد صرف پھل نہیں ہے،صرف پھل کے لیے عربی میں فواکہ کا لفظ آتا ہے۔ثمرہ کالفظ اس سے بہت وسیع ہے جس میں ہر طرح کی نعمتیں بشمول غذائی اجناس کے شامل ہیں۔

آیت کی تاویل میں راقم کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ جب اہل جنت کسی نعمت سے لطف اندوز ہوں گے تو وہ اس نعمت میں اس عمل کی لذت کو بھی محسوس کریں گے جس عمل کے صلہ میں وہ نعمت ملی ہوگی یعنی عمل اوراس کے صلہ میں مشابہت ہوگی۔

رزق قرآن مجید میں صرف مادی رزق کے لیے ہی استعمال نہیں ہوتا ہے بلکہ روحانی رزق کے لیے بھی جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔تو اہل جنت جنت کی نعمتوں کا جہاں مادی لحاظ سے لطف لیں گے وہیں وہ اس میں روحانی لذت بھی محسوس کریں گے اور یہ روحانی لذت وہ اس عمل کوکرتے ہوئے دنیا میں بھی محسوس کر چکے ہوں گے۔تفسیر ماجدی کامطالعہ کرتے ہوئے پتہ چلا کہ یہ رائے متقدمین میں بھی بعض حضرات کی ہے۔

بعض اہلِ لطائف نے آیت سے یہ نکتہ بھی نکالا ہے کہ اسی دنیا کے اعمالِ حسنہ جنت میں طرح طرح کی نعمتوں کی شکل وتمثیل اختیار کرلیں گے اور اہلِ جنت کو اپنے حسناتِ دنیوی اور ان کے ثمراتِ اخروی کے درمیان ایک خاص تشابہ وتناسب محسوس ہوگا۔(۱۴)

وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ: ازواج مطہرات یعنی پاک بیویاں۔ **مطهرة من القدر والاذى (۱۵)قيل مطهرة من مساوى الاخلاق (۱۶)فالمراد بها طهارة ابدا لانهن وطهارة ازواجهن من جميع الخصال الذميمة۔(۱۷)**

یہاں ایک پہلو سے تکمیلِ نعمت کا بیان ہے۔انسان کو خواہ جتنی بھی نعمتیں میسر آجائیں جب تک اس کی ازدواجی زندگی نہ ہو جس کے ساتھ وہ اپنی نعمتوں کو بانٹ سکے اسے حقیقی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔انسان کی اسی فطرت کا لحاظ کرکے فرمایا کہ اس میں اہلِ جنت کے لیے پاک بیویاں ہوں گی۔

وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ : یہ اہلِ جنت پر وہ احسانِ عظیم ہوگا جس سے اس کی ساری نعمتوں کی حیثیت میں بے تحاشا اضافہ ہوجائے گا۔انسان کو ملنے والی نعمت چاہے کتنی ہی بڑی ہو جب یہ پتہ ہو کہ یہ عارضی ہے تو اس کی لذت پھیکی پڑجاتی ہے جب کہ اہلِ جنت کی نعمتیں ابدی ہوں گی جس کو کبھی زوال پیش نہیں آئے گا۔

حواشی ومراجع

۱۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن جلد اول، آیت ۱۷ ۲۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن جلد اول، آیت ۱۷
۳۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن جلد اول، آیت ۱۹ ۴۔ الرازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب، آیت ۱۹
۵۔ بیضاوی، ناصر الدین، انوار التنزیل واسرار التاویل، آیت ۱۹
۶۔ قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع لاحکام القرآن، آیت ۱۹
۷۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن جلد اول، آیت ۱۹ ۸۔ دریا آبادی، عبدالماجد، تفسیر ماجدی، جلد اول، آیت ۱۹
۹۔ دریا آبادی، عبدالماجد، تفسیر ماجدی، جلد اول، آیت ۱۹
۱۰۔ دریا آبادی، عبدالماجد، تفسیر ماجدی، جلد اول، آیت ۲۱
۱۱۔ الانصاری، ابن منظور، لسان العرب، معنی لعل۔ ۱۲۔ الرازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب، آیت ۲۲
۱۳۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن جلد اول، آیت ۲۳
۱۴۔ دریا آبادی، عبدالماجد، تفسیر ماجدی، جلد اول، آیت ۲۵ ۱۵۔ الطبری محمد بن جریر، جامع البیان فی تاویل القرآن، آیت ۲۵
۱۶۔ بغوی، ابو محمد الحسین بن مسعود بن محمد، معالم التنزیل، آیت ۲۵
۱۷۔ الرازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب، آیت ۲۵

اسلامی معاشرہ

عائلی نظامِ زندگی پر مغربی تہذیب وثقافت کے اثرات

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

محمد اسامہ فلاحی

امتِ مسلمہ کو درپیش خطرات میں سے ایک بڑا خطرہ عائلی نظامِ زندگی پر مغربی تہذیب وثقافت کا غیر معمولی اثر انداز ہونا ہے۔اس تہذیب کو فروغ دینے کے ذرائع نہ صرف تیز، بلکہ پرکشش بھی ہیں،اس لیے مسلمانوں کی عائلی زندگی اس سے متاثر ہورہی ہے اورانہیں ایک بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔موجودہ حالات میں اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ نسلِ انسانی پر مغربی تہذیب وثقافت کے کیا اثرات پڑ رہے ہیں؟مسلمانوں کے عائلی نظام کو اس سے کیا خطرات لاحق ہیں؟ نیز امتِ مسلمہ ان کا کیسے مقابلہ کرسکتی ہے؟ان سوالات پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عائلی نظام زندگی سے کیا مراد ہے؟اوراس کے بنیادی عناصر کیا ہیں؟

عائلی نظام کی تعریف

جدید دور میں 'عائلی نظام' کے لیے انگریزی زبان میں 'پرسنل لأ(Personal Law) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔اس میں خاندان،حسب ونسب،شادی،طلاق، حضانت، رضاعت،وصیت، ولایت، نان نفقہ، وقف اور میراث وغیرہ شامل ہیں۔اس اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے مصر کے مشہور فقیہ محمد قدری پاشا (۱) نے کیا۔(۲)

دنیا کی قیادت اس وقت یورپ کے ہاتھوں میں ہے، لہٰذا وہ نہ صرف سیاسی،معاشی اور عسکری لحاظ سے، بلکہ تہذیب وتمدن کے حوالے سے بھی پوری دنیا کو اپنے استبدادی نظام میں جکڑے ہوئے ہے۔یہی وجہ ہے کہ مغرب کے سماجی اور تہذیبی اثرات اس وقت دنیا کے گوشے گوشے میں بہ آسانی محسوس کیے جاسکتے ہیں، البتہ اسے اگر کسی سے خطرہ ہے تو صرف 'اسلامی تہذیب' ہے، کیوں کہ صرف اسی کے بنیادی خدوخال ایسے ہیں جو مغربی تہذیب کے خلاف مضبوط فکری مزاحمت رکھتے ہیں۔نیز دونوں تہذیبوں کے درمیان عقائد اور افکار و

نظریات کا بھی واضح فرق نظر آتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ دنیا کی دو مشہور تہذیبوں -اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب - کا تقابلی جائزہ لیا جائے، کیوں کہ اس وقت مقابلہ ان ہی کے درمیان ہے (۳) اور عائلی نظام زندگی پر ان کے نمایاں اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں فرق

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو دونوں کے درمیان درج ذیل بنیادی فرق نظر آتا ہے:

اسلامی تہذیب کی بنیاد 'توحید' پر ہے۔ اس نظریہ کے مطابق کائنات میں پائی جانے والی اشیا اور بذاتِ خود انسان بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اس لحاظ سے اس کی تمام تر صلاحیتیں اللہ رب العالمین کی عطا کردہ ہیں جنہیں وہ اس کی مقرر کردہ حدود و قیود کے اندر ہی استعمال کر سکتا ہے اور اس سلسلے میں وہ وحی الٰہی کا نہ صرف محتاج ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ بھی ہے۔ اسلامی تہذیب کے افکار و نظریات کا مختصراً جائزہ لیا جائے تو اس کے نمایاں نکات حسب ذیل ہیں:

☆ تصورِ الٰہ

☆ مخصوص عقائد

☆ تصورِ انسان

☆ تصورِ کائنات

☆ تصورِ آخرت

مغربی تہذیب کی بنیاد 'مادیت' پر ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کسی بالاتر ہستی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ اس کے حاملین کا ماننا ہے کہ اخلاقی اصول و قوانین کا معیار انسانی عقل خود طے کر سکتی ہے، اس میں کسی مذہب یا وحی الٰہی کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ اخلاقی قوانین دراصل سماج کے پیدا کردہ ہیں۔ مغربی تہذیب کے افکار و نظریات کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل معروف نکات سامنے آتے ہیں:

☆ مذہب کو فرد کا ذاتی مسئلہ قرار دیا گیا۔ (سیکولرزم)

☆ فرد کو مکمل طور سے آزادی دے کر خدا کے مقابلے میں مختارِ کل بنا دیا گیا۔ (ہیومنزم)

☆ دنیاوی زندگی ہی کو کل سمجھتے ہوئے تمام امیدوں اور خواہشات کا مرکز سمجھا گیا اور اس کے حصول کے لیے تمام افعال کو جائز کر دیا گیا، ایسے میں آخرت کے تصور کا خاتمہ ہو گیا۔ (میٹیریلزم)

☆ وحی الٰہی اور رسالت کے تصور کا انکار کرتے ہوئے عقل، مشاہدہ اور تجربہ کو ہی صحیح وغلط کا معیار سمجھا گیا۔(امپریلزم)

☆ عورت کو آزادی کے نعروں کے جال میں پھنسا کر اسے جنسی اباحیت، فحاشی، عریانیت اور زنا کاری کا محور ومرکز سمجھا گیا۔(لبرلزم)

☆ ڈارون کے نظریہ 'انسان بھی جانوروں کی طرح حیوان ہے' کو فروغ دیا گیا، جس سے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے تصور کا خاتمہ ہو گیا۔(ڈارونزم)

☆ قانون بنانے کا حق انسان کو دے دیا گیا۔اب وہ جس چیز کو چاہے حرام کر دے اور جس چیز کو چاہے حلال کر دے۔(ڈیموکریسی)

☆ دنیاوی زندگی کو ہی کل سمجھا گیا، چناں چہ عیش پرستی کو اس کا لازمی جز کر دیا گیا اور اس کے لیے دولت کا حصول بہر صورت جائز کیا گیا، خواہ وہ جوئے، سود اور اسی قبیل کے دیگر ذرائع سے ہی کیوں نہ آئے۔(کیپٹل ازم)

ظاہر ہے کہ درج بالا دونوں نظریات میں مشرق ومغرب کا فرق ہے۔دونوں تہذیبوں کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کے برعکس اسلام اور مسلمانوں کی اپنی ایک الگ تہذیب وثقافت ہے اور یہ مغربی تہذیب کے بنیادی افکار ونظریات اور عقائد سے کلیۃً متضاد ہے۔اس میں اعلیٰ اتھارٹی اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، جب کہ مغربی تہذیب میں یہ مقام انسانوں کو ہی ملا ہوا ہے اور مذہب یا وحی الٰہی کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔چناں چہ اس بنیادی فرق کی وجہ سے دونوں کے بنیادی افکار ونظریات میں بھی واضح فرق نظر آتا ہے۔مغربی تہذیب کے اس انحراف میں جہاں مذہبی بے زاری، صنعتی انقلاب، تعلیمی نظام، سائنس وٹکنالوجی میں غیر معمولی ترقی، ہمہ جہت آزادی کے تصور نے اہم کردار ادا کیا ہے وہیں بعض مغربی مفکرین بالخصوص ڈارون، کارل مارکس، اینگلز اور سگمنڈ فرائڈ وغیرہ کا بھی ہاتھ رہا ہے۔

مغربی تہذیب میں عائلی نظام زندگی کی بنیاد اور نتائج

پچھلی گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی تہذیب میں انسان ہی اعلیٰ اتھارٹی پر قابض ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اصول وضوابط خود وہی اپنی عقل کی بنیاد پر طے کرے گا، مذہب اور وحی الٰہی کا اس میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ایسے میں ظاہر ہے کہ بشری کم زوری اور فطرت کے مطابق عائلی نظام زندگی کے جو

اصول وضوابط اور قوانین دنیا کے سامنے پیش کیے گئے اس میں 'ذاتی مفاد' اور 'ذاتی لذت' کو نمایاں مقام دیا گیا، نیز اخلاقی اقدار کی بنیاد 'مادیت' پر رکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں جہاں ایک طرف مادی سہولتیں، آسانیاں اور مشینیں وجود میں آئیں وہیں دوسری طرف انسانی تہذیب اور وجودِ انسانی سے وابستہ رشتوں اور محبتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ قابلِ توجہ بات یہ بھی ہے کہ ان اصولوں کے تحت انسان خود کو اپنی ذات تک ہی محدود کر لیتا ہے۔ چناں چہ وہ صرف اپنے لیے کمانا، خرچ کرنا اور عیش وآرام کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ان ہی اسباب سے نفسانی خواہش اور ذاتی مفاد پر مبنی یورپ کا عائلی نظام تباہ وبرباد ہو چکا ہے۔ چناں چہ اس میں روایتی کنبوں کا تصور ناپید ہو رہا ہے، بغیر شادی کے اکٹھے رہنے کا تصور (Live in Relationship)، نیز اکیلے زندگی بسر کرنے کے رجحان میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ زوجین ایک دوسرے کے حقوق سے نابلد ہیں اور اگر واقف بھی ہیں تو ادا نہیں کرتے۔ عورت گھر کی ذمہ داری سنبھالنے کو عار سمجھتی ہے۔ شادی کے تناسب میں غیر معمولی کمی، طلاق کی شرح اور ناجائز بچوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ والدین کے پاس اولاد کے لیے اور اولاد کے پاس والدین کے لیے وقت نہیں ہے۔ 'اولڈ ایج ہوم' کا کلچر عام ہو چکا ہے۔ اس افسوس ناک صورتِ حال پر پروفیسر ثریا بتول علوی نقد کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''عورت اور مرد دوش بدوش کام کر رہے ہیں، مگر گھر اب خالی ہو گئے ہیں۔ بچے ماؤں سے، شوہر بیویوں سے اور گھر گھر والیوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ بیمار اور بوڑھے کسی ہمدرد اور غم خوار کو ترس گئے ہیں۔ خاندانی نظام مکمل طور پر تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ افرادِ خانہ کے اندر محبت والفت کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور انسان سکون سے محروم ہو گیا، جو صرف خاندان ہی فراہم کر سکتا ہے۔ خاندان کا ٹوٹنا دراصل پورے معاشرے کا درہم برہم ہونا ہے۔ یہ اتنا بڑا خسارہ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ اسے زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتا۔''(۴)

خود مغرب عائلی نظام میں کیے ہوئے اپنے تجربات اور افکار ونظریات سے پریشان ہے، چناں چہ Richard G Wilkins (1952-2012) اسلامی اور مغربی عائلی نظام کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''مادی وسائل اور سائنس وٹکنالوجی کے اعتبار سے ہم ترقی یافتہ اقوام ہیں اور آپ تیسری دنیا کے لوگ ہیں، مگر خاندانی نظام اور سماجی واخلاقی اقدار کے اعتبار سے مسلمان ترقی یافتہ اور ہم پس ماندہ ہیں۔ عورت کو انسان سازی کے کام سے ہٹا کر اس عورت پر بھی بڑا ظلم ہوا اور ساتھ ہی معاشرے کے ساتھ بھی۔ عورت اور بچے کا بہترین مفاد اسی میں ہے کہ شادی اور خاندان

کے ادارے کی مضبوطی اور تقدس کی بحالی کی جائے۔خاندان اور شادی کا ادارہ ماں اور بچے کے لیے تحفظ کے بڑے بڑے ادارے ہیں۔مغربی معاشرے میں سب سے زیادہ مظلوم عورت اور بچہ ہیں۔ان سے عبرت حاصل کریں اور اپنے ممالک کو ان تجربات سے بچائیں۔''(۵)

اسلامی عائلی نظام زندگی پر مغربی تہذیب کے اثرات

دورِ حاضر میں اہلِ مغرب کی ناقابل یقین ترقی اور جدید ٹکنالوجی کے ذریعے نت نئی ایجادات سے اقوامِ عالم بہت زیادہ متاثر ہوئی ہیں، جس کی وجہ سے انہوں نے مغربی افکار ونظریات اور تہذیب وتمدن کو اختیار کرنے میں ہی اپنی کامیابی وکامرانی کا راز سمجھا۔عالمِ اسلام بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا اور مسلمانوں نے بھی خواہی نہ خواہی مغربی تہذیب وتمدن کے بہت سے افکار ونظریات کو اپنی زندگی کے نظامِ حیات میں شامل کرلیا ہے۔ان ہی میں سے ایک عمل امت مسلمہ کا عائلی نظام زندگی میں اس تہذیب سے متاثر ہونا ہے۔راقم الحروف نے طوالت کے پیش نظر اس مقالے میں 'عائلی نظام' کے صرف ایک پہلو 'خاندان' اور اس کے بنیادی عناصر (والدین، نکاح، زوجین، اولاد اور طلاق) کو موضوعِ بحث بنایا ہے، نیز ان پر مغربی تہذیب وثقافت کے اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

خاندان

اسلام کے عائلی نظام میں خاندان کی اہمیت وافادیت پر خصوصی زور دیا گیا ہے، کیوں کہ یہ معاشرے کی سب سے اہم اور بنیادی اکائی ہے اور اس کی ترقی اور نشوونما کا انحصار بھی بہت حد تک خاندانی استحکام پر منحصر ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں ایک تہائی احکام عائلی نظام زندگی سے متعلق ہیں۔اس کا مقصد جہاں ایک طرف نسلِ انسانی کو باقی رکھتے ہوئے اسے تحفظ فراہم کرنا ہے، وہیں دوسری طرف ایسے افراد تیار کرنا بھی ہے جو ملک وملت کی تعمیر وترقی میں اپنا مثبت کردار ادا کرسکیں۔

اسلامی نظام میں خاندان کا وجود مرد اور عورت کے درمیان نکاح سے ہوتا ہے، پھر اس میں ان کے بچے، شوہر، والدین اور دیگر خونی رشتے دار بھی شامل ہوکر ایک وسیع خاندان کو تشکیل دیتے ہیں۔البتہ شوہر کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیوی، بچوں کی کفالت، نگہداشت اور تعلیم وتربیت کرے اور اسی بنیاد پر وہ گھر کا سربراہ ہوتا ہے۔بیوی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر کو سنبھالے۔واضح رہے کہ مرد کی سربراہی کا یہ مطلب نہیں ہے

کہ عورت کا درجہ اسلام کی نظر میں کم تر یا کم زور ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس نے مرد و عورت دونوں کی سرگرمیوں کے دائرے متعین کر دیے ہیں اور ان کو ان ہی حدود میں رہ کر کام کرنا ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

الا، کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته،فالامام الذی علی الناس راع و هو مسئول عن رعیته،والرجل راع علی أهل بیته و هو مسئول عن رعیته،والمرأة راعیة علی أهل بیت زوجها و ولده و هی مسئولة عنهم.(۶)

''تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور اس سے اس کے ماتحتوں سے متعلق سوال ہوگا۔پس حکم راں نگراں ہے اور اس سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔آدمی اپنے گھر والوں پر نگراں ہے اور اس سے اس کے زیردستوں کے بارے میں باز پرس کی جائے گی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگراں ہے، اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

اسلام نے درج بالا مقاصد کے پیشِ نظر خاندان اور اس کے اہم جز (نکاح) کو بہت اہمیت دی ہے،البتہ اللہ تعالیٰ نے مؤخر الذکر کو لازمی اور اٹل حیثیت نہیں دی، بلکہ اس بات کی گنجائش رکھی کہ اگر زوجین کے درمیان تمام اصلاحی کوششوں کے باوجود بھی نباہ ہونا مشکل ہو رہا ہے تو بھلے طریقے سے شریعت کے مطابق دونوں طلاق یا خلع کے ذریعہ علیٰحدہ ہو جائیں۔یہ پہلو بھی درحقیقت ایک انعامِ خداوندی ہے،البتہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بہ کراہت ہی اجازت دی ہے،جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما أحل اللّٰه شیئاً أبغض الیه من الطلاق۔(۷)

''اللہ تعالیٰ نے طلاق سے زیادہ کسی ناپسندیدہ چیز کو حلال نہیں قرار دیا۔''

نظریۂ خاندان کے حوالے سے اگر مغربی تہذیب کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ یہاں خاندان ایک ایسا معاشرہ ہے جو ایک سول معاہدے سے وجود میں آتا ہے۔نیز یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اس کا وجود مرد اور عورت کے ذریعہ ہو، چناں چہ مغرب کے بعض ممالک میں یک جنس (Unisex) خاندان کا تصور بھی عام ہو چکا ہے اور اس کے مطابق مرد کے بغیر بھی خاندان بن سکتا ہے۔عالمی کنونشن 1979 (سیڈا) کی سفارشات دو مردوں کے اکٹھے رہنے، دو عورتوں کے اکٹھے رہنے اور بغیر نکاح کے ساتھ رہنے کو بھی خاندان کا نام دیتی ہیں۔مزید برآں کہا گیا کہ بچوں کی ضرورت کو جدید طبی وسائل سے پورا کیا جا سکتا ہے۔اس تصور سے ماں کی حیثیت اور مقام کا بھی خاتمہ ہو گیا۔چناں چہ اصول بنایا گیا کہ ماں کا

کردار (Motherhood) حکومت اور معاشرے کی اجتماعی ذمہ داری ہے،صرف عورت کے ساتھ ہی یہ کام مخصوص نہیں کیا جاسکتا۔اسی لیے مغرب میں مرد کو گھر کے سربراہ کی حیثیت سے تسلیم نہ کرتے ہوئے تمام عائلی قوانین میں عورت کو خود مختار بنایا جارہا ہے، جیسے بیٹی اپنے نکاح اور طلاق کا فیصلہ خود کرسکتی ہےاورولدیت میں اندراج باپ کے بجائے ماں کے نام سے کرسکتی ہے۔

مغربی مفکرین نے بھی اپنی تحریروں میں روایتی خاندان کے تصور کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔معروف مفکر Sir Edmund Ronald Leach (1910-1989) نے کہا:

''خاندان اپنے افراد پر بہت زیادہ دباؤ ڈالتا ہے،جس کا نتیجہ تشویش اور ذہنی دباؤ کی صورت میں نکلتا ہے جو بیرونی دنیا کے متعلق دشمنی،خوف اور بدگمانی کو پروان چڑھاتے ہیں۔''(۸)

اسی طرح Linda Nicholson ca1959 خاندان کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''متبادل کنبے روایتی خاندانوں کے مقابلے میں تعلقات کو زیادہ اہم اور مضبوط بناتے ہیں۔یہ متبادل کنبے ہم جنس لونڈوں(Gays) اور ہم جنس عورتوں(Lesbians) کے جوڑوں سے لے کر بچوں اور بچوں کے بغیر صحبتوں اور مخلوط رہائشوں تک پائے جاتے ہیں۔''(۹)

خاندان کے تعلق سے درج بالا نظریات غیر فطری اور عقلِ سلیم کے بالکل خلاف ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس کے پس منظر میں انسانی عقل کام کررہی ہے اور مذہب یا وحی الٰہی کو کنارے کردیا گیا ہے۔مغربی مفکرین نے ان افکار کے ذریعے خاندان کی بنیادی ساخت اور ڈھانچے کو نہ صرف بدل کر رکھ دیا، بلکہ انہیں مشرقی ممالک بالخصوص مسلم ممالک میں فروغ دینے کی ہر ممکن کوششیں کی ہیں۔خاندان کے مرکزی کردار 'عورت' کو کچھ اس طرح بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ جیسے صرف وہی اس وقت تباہ حال، ناخواندہ، بیمار اور مختلف مسائل کا شکار مخلوق ہے اور پھر اس کی آڑ میں اقوام متحدہ سمیت دیگر عالمی تنظیمیں عورتوں کے 'حقوق' اور 'ترقی' کے لیے دنیا بھر میں کانفرنسیں کررہی ہیں۔چناں چہ اقوام متحدہ کی جانب سے 'بیجنگ پلس فائیو'(05/جون 2000، بمقام نیویارک) کے خصوصی اجلاس میں جو بنیادی ہدف طے کیے گئے ان میں سے ایک مسلم معاشرے کے خاندانی نظام کو ختم کرنا بھی تھا۔حالاں کہ خود مغرب کو بھی اس سلسلے میں نقصان اٹھانا پڑا ہے اور اب ان کے یہاں سے خاندانی نظام کا لگ بھگ خاتمہ ہوچکا ہے۔اس کے مضر اثرات نمایاں طور سے مردوں، عورتوں اور بچوں پر پڑے ہیں اور ان میں سے اکثر ذہنی مریض بن چکے ہیں۔ان میں

’شیزوفینیا‘(Schizophrenia) کی بیماری عام ہے، جوکم زور اور خراب خاندانی نظام ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ان حالات کی وجہ سے مغرب کل بجٹ کا 40% ذہنی صحت پر خرچ کرتا ہے۔

امتِ مسلمہ کی بدقسمتی یہ رہی کہ وہ مغربی تہذیب کی بنیادوں اور اس کے پرفریب نعروں کو سمجھ نہیں سکی اور اس کے مضر اثرات کو بھی قبول کرتی چلی گئی۔اس کا نقصان اسے اپنے عائلی نظام زندگی میں بھی اٹھانا پڑ رہا ہے۔ چناں چہ اب مسلمانوں کے خاندان بھی چھوٹے سے چھوٹے ہوتے چلے جا رہے ہیں،نوجوان لڑکے لڑکیوں میں تاخیر سے شادیوں کا رجحان بڑھ رہا ہے۔مرد اور خواتین دونوں میں آبادی کی تخفیف کرنے یا تنہا ہی زندگی بسر کرنے کے خیالات جنم لے رہے ہیں۔ یقیناً یہ مسلم خاندانوں کا افسوس ناک پہلو ہے۔

والدین

مسلمانوں کے عائلی نظام کا دوسرا اہم جز والدین ہیں۔اسلام نے انہیں جس مقام ومرتبہ اور قدر ومنزلت سے نوازا ہے، کسی دوسرے مذہب اور دین نے نہیں دیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہ کثرت ان کے ساتھ نیک برتاؤ اور حسنِ سلوک کرنے کا حکم معاً اپنے بعد دیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

وَاعۡبُدُوۡا اللّٰهَ وَلاَ تُشۡرِکُواۡ بِهِ شَيۡئاً وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ إِحۡسَاناً.(۱۰)

’’اور تم سب اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے ایمان رکھنے والوں کو اس بات کی بھی تاکید کی ہے کہ اگر والدین بوڑھے اور کم زور ہو جائیں تو بھی ان کی خدمت کی جائے اور ان کے حق میں دعائیں کی جائیں۔ایسا نہ ہو کہ جب والدین اپنے بڑھاپے اور بے چارگی کی عمر کو پہنچیں تو اولاد انہیں بے کار اور بے مصرف سمجھ کر گھر سے نکال دے یا ان کے ساتھ برا سلوک کرے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَقَضَى رَبُّکَ أَلاَّ تَعۡبُدُواۡ إِلاَّ إِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ إِحۡسَاناً إِمَّا يَبۡلُغَنَّ عِندَکَ الۡکِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوۡ کِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلاَ تَنۡهَرۡهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوۡلاً کَرِيۡماً.وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ وَقُل رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا کَمَا رَبَّيَانِيۡ صَغِيۡراً۔(۱۱)

’’تمہارے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرو اور

والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے
ہوکر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ
بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار! ان
پر رحم فرما! جس طرح انہوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔"

اس کے برعکس مغرب کے عائلی نظام میں والدین کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ چناں چہ وہاں والدین کے پاس نہ تو اولاد کے لیے اور نہ اولاد کے پاس والدین کے لیے وقت، محبت اور جگہ ہے۔ والدین اپنے بچوں کو مارنا تو دور ڈانٹ بھی نہیں سکتے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو اسے پولس گرفتار کر لے گی، یا اسے جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔ مغربی مفکرین اور قانون دانوں کی حتیٰ الامکان کوشش ہے کہ والدین کے اختیار کو کم سے کم کیا جائے اور بچوں کو خود مختار اور آزاد بنایا جائے۔ ان ہی اسباب سے بچے اپنے والدین کو ایک بوجھ سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔ اولڈ ایج ہوم (Old Age Home) کا تصور بھی مغربی تہذیب کا دیا ہوا ہے، جہاں والدین کو ان کے بچے دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ جاتے ہیں اور سال میں کچھ خاص موقع پر ملاقات کر کے سمجھتے ہیں کہ فرض ادا ہوگیا۔

مسلمانوں کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ انہوں نے مغربی تہذیب کی تقلید میں والدین کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا ہے۔ نوجوان نسل کی اکثریت ان کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہے۔ ان کی خدمت اور احترام کا جذبہ مفقود ہو رہا ہے۔ ذات پرستی (Individualism) اور خودغرضی (Selfishness) بڑھتی جارہی ہے۔ بالخصوص شادی کے بعد والدین کے لیے گھروں میں یا تو جگہ نہیں ہوتی ہے یا ہوتی بھی ہے تو انہیں وہ مقام اور حیثیت نہیں دی جاتی ہے جس کی تاکید اسلام نے کی ہے۔ بسا اوقات ان سے مار پیٹ، ڈانٹ ڈپٹ اور بدسلوکی کی جاتی ہے، یا ان کی ضروریات کو پورا نہیں کیا جاتا ہے۔ انہیں روحانی، نفسیاتی اور جسمانی تکلیفیں دی جاتی ہیں۔ نیز مسلم ممالک میں 'اولڈ ایج ہوم' کا تصور عام ہو چکا ہے۔ خود ہندوستان میں اب ایسے آشرم یا ادارے قائم ہو رہے ہیں جن میں بوڑھے افراد کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ (۱۲)

زوجین

اسلامی عائلی نظام زندگی کا تیسرا اہم حصہ 'زوجین' ہیں۔ اسلام میں نکاح کا مقصد یہ ہے کہ نفس کی تسکین ہو اور نسلِ انسانی کا سلسلہ مزید آگے بڑھتا رہے۔ نیز مرد وعورت آپس میں محبت ومودت، شفقت ومہربانی، باہمی

تعاون کے ساتھ زندگی بسر کریں، تاکہ ایک محفوظ خاندان پروان چڑھ سکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً.(۱۳)

''اوراس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عورتوں سے حسنِ سلوک کی تاکید کی ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

ان المرأة خلقت من ضلع،لن تستقيم لک علیٰ طريقة ،فان استمتعت بها استمتعت بها و بها عوج،و ان ذهبت تقيمها كسرتها،و كسرها طلاقها.(۱۴)

''عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، تم کسی بھی صورت میں اسے سیدھا نہیں کر سکتے، اگر تم اس کے ٹیڑھا رہتے ہوئے لطف اندوز ہو گے تبھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہو، ورنہ اگر سیدھا کرنے لگو گے تو ٹوٹ جائے گی اور اس کا ٹوٹنا طلاق ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے پیشِ نظر میاں بیوی کے حقوق اور دائرہ کار متعین کر دیے ہیں اور قرآن و سنت میں دونوں کو تاکید کی ہے کہ وہ اپنے حقوق کا خیال رکھیں، تاکہ عائلی نظام زندگی متاثر نہ ہو، یعنی دونوں کو اس بات کا پابند بنایا ہے کہ وہ حقوق کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں، ورنہ ان سے باز پرس کی جائے گی، لیکن اس سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے حریف ہیں، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے معاون اور رفیق کار ہیں:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ.(۱۵)

''اور مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔''

اس کے برعکس مغربی عائلی نظام میں نکاح کی کوئی خاص اہمیت وضرورت نہیں ہے۔ نیز اس میں مرد اور عورت دونوں کو یکساں 'حقوق'/'آزادی' دی گئی ہے۔ یعنی ایک طرح سے دونوں کو ایک دوسرے کے حریف کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب عورت نکاح کے بعد اپنی عائلی زندگی کا آغاز کرتی ہے تو اس کا ذہن مرد کو گھر کا سربراہ اور نگراں کے طور پر قبول نہیں کرتا اور پھر ازدواجی زندگی تلخ سے تلخ ترین ہوتی

چلی جاتی ہے۔اسی سوچ کے ساتھ جب وہ مغربی تہذیب کے مختلف پر فریب نعروں کے زیر اثر باہر نکلتی ہے تو بچوں کی تعلیم وتربیت، پرورش اور دیکھ بھال نیز دیگر گھریلو ذمہ داریاں متاثر ہوتی ہیں۔ان تمام کے مضر اثرات کہیں نہ کہیں عائلی نظام پر بھی پڑتے ہیں۔

مغربی عائلی نظام میں زوجین کے حوالے سے ایک مضر پہلو، جس نے اس پر نمایاں اثر ڈالا ہے، وہ یہ کہ اس میں بیوی کے نان نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر نہیں ڈالی گئی ہے اور نہ اسے اس کا پابند بنایا گیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے گھر سے باہر قدم نکالتی ہے، جو اس کے اخلاقی، معاشی، ذہنی، دماغی اور جسمانی استحصال کا سبب بنتا ہے۔بدقسمتی یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی مسلمانوں کے خاندانی نظام میں مغربی تہذیب اور اس کے افکار ونظریات نے اپنے قدم جما لیے ہیں، جس کی وجہ سے زوجین کے درمیان معمولی باتوں پر لڑائی، جھگڑا، مار پیٹ، تشدد اور طلاق کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے حقوق وفرائض سے غافل ہیں۔اس میں بہت حد تک مغربی فلموں، کہانیوں، ناولوں، ڈراموں اور اسی قبیل کے دیگر ذرائع ابلاغ کا اہم کردار رہا ہے، جن میں ازدواجی زندگی کو حقیقی زندگی سے بالکل ہی مختلف اور خوش نما بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔مرد اور عورت جب اپنی حقیقی زندگی میں قدم رکھتے ہیں اور معاملات کو اس سے برعکس پاتے ہیں تو وہ ذہنی دباؤ اور انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں، پھر انہیں خاندانی نظام کو باقی رکھنے میں کوئی کشش نہیں رہتی ہے۔

اسباب ومظاہر

امت مسلمہ کی بدقسمتی رہی کہ اس کے پاس اسلامی تہذیب وثقافت کا پورا ایک نظام ہونے کے باوجود وہ مغربی تہذیب سے متاثر ہوتی چلی گئی اور اس کا اثر مسلمانوں کے عائلی نظام پر بھی ہوا۔اس صورت حال پر اگر غور کیا جائے تو اس کے دو اسباب نظر آتے ہیں:

(الف) داخلی عوامل

مسلمانوں کے عائلی نظام زندگی پر مغربی اثرات کا ایک اہم سبب خود ان کا اپنے دین ومذہب اور اسلامی تہذیب سے دور ہونا ہے۔اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب تک مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم کو، جو ان کی شریعت کا پہلا ماخذ اور سراپا ہدایت ہے، نیز احادیث یا اسوۂ نبوی کو تھامے رکھا، نہ تو کسی دوسری تہذیب وثقافت سے متاثر ہوئے اور نہ ان کی عائلی نظام زندگی میں کوئی

تہذیب شگاف ڈال سکی، کیوں کہ یہ دونوں ہی ایسے ماخذ ہیں جن کے ذریعے خیر وشر میں تمیز اور مختلف تہذیبوں کے تاریخی نشیب وفراز کا مطالعہ کرتے ہوئے بہ آسانی عبرت ونصیحت حاصل کی جاسکتی ہے۔

دوسرا اہم سبب، جس نے مسلمانوں کی عائلی نظام زندگی پر مغربی تہذیب کے اثرات نقش کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، وہ ان کا اپنے حقیقی تعلیمی نظام سے دوری اختیار کرتے ہوئے مغربی نظام تعلیم کو اختیار کرنا ہے۔ اولاً تو امت مسلمہ تعلیمی میدان میں پیچھے ہے، مزید ستم یہ کہ اس نے ایک ایسے تعلیمی نظام کی پیروی کی ہے جس میں مرکزیت اللہ رب العزت کی نہیں ہے۔ ایسی تعلیم سے فارغ افراد کی قوتِ فکر وعمل کا منہج کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر خورشید احمد اپنے مقالہ میں سورۃ العلق کی ابتدائی آیات کی تشریح میں لکھتے ہیں:

> ''ان آیات میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ پڑھو، اللہ کے نام سے، یعنی اللہ کی معرفت، اللہ سے رشتہ جوڑنا۔ مالک سے انسان کا رشتہ ان کی پہلی منزل ہے۔ اس رشتے کے بغیر جو علم بھی ہے وہ نامکمل اور ناپختہ ہے، جس کی حیثیت محض خبر (Information) کے گرد گھومنے تک محدود رہتی ہے اور وہ حکمت (Wisdom) تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔''(۱۶)

(ب) خارجی عوامل

جب کوئی قوم کسی دوسری قوم پر غالب آتی ہے تو مغلوب قوم زندگی کے ہر میدان میں اس کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ یہی حال امتِ مسلمہ کے ساتھ ہوا۔ نیز اس میں یورپ کی تحریک آزادیِ نسواں، صنفی مساوات، حقوق نسواں اور نیو ورلڈ آڈر وغیرہ کے پرفریب نعروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یورپ نے اپنے افکار ونظریات کے فروغ کے لیے نہ صرف اقوام متحدہ، سیڈا اور اسی طرح کی دیگر بین الاقوامی تنظیمیں تشکیل دیں، بلکہ ان کے تحت مختلف کانفرنسیں، سیمینار اور پروگرام وغیرہ منعقد کرنے کی پالیسی بنائی ہے۔ مغربی مفکرین بھی اپنی تحریروں میں اسلامی تہذیب کو اپنی قوم ونسل کے لیے 'خطرہ' ثابت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ امریکہ کے ایک مشہور جریدے میں اس کے مدیر مارٹن بی زگ نے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا:

> ''جس طرح روس کے آنجہانی رہنما جوزف اسٹالن نے کمیونزم کے دفاع کے لیے یورپ و امریکہ سے طویل جنگ لڑی، اسی طرح اب مغرب کو اپنے کلچر ونظریات کی بقا کے لیے اسلام سے جنگ لڑنی ہوگی، کیوں کہ مسلم بنیاد پرست اپنے متشددانہ نظریات کو دنیا بھر میں پھیلانے میں مصروف ہیں، جن سے نہ صرف مغرب کے سیاسی ومعاشی فلسفوں اور ان کے

نظاموں، ان کے کلچر اور عالمی مفادات کو شدید خطرات لاحق ہیں بلکہ ان کے مذہبی عقائد بھی اسلام کے خطرے کی زد میں ہیں۔ اس کا مداوا سوائے جنگ کے اور کچھ نہیں ہے۔"(۱۷)

رہی سہی کسر مغرب کے دیے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام، سودی معاشی نظام، بے روزگاری، مہنگائی، پرائیویٹ تعلیمی نظام، آئی ایم ایف، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، ستی فیملی پلاننگ، کرپشن اور عالمی مالیاتی اداروں کی سخت شرائط نے پوری کردی ہے۔ یہ سب ایسے جال ہیں جن میں مسلم ممالک بری طرح پھنسے ہوئے ہیں، نیز ان کے ذریعہ فی کس آمدنی اتنی کم کردی گئی ہے کہ مرد کا خاندان کی کفالت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ شادی کے بغیر آزادانہ زندگی گزارنے کو زیادہ پسند کرتا ہے۔

مسلمانوں کے عائلی نظام کو خراب کرنے میں مغرب کے ذرائعِ ابلاغ نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت سے یقیناً انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن تجارتی پہلو سے جو کلچر اس سے وجود میں آرہا ہے وہ انتہائی خطرناک ہے۔ اس کے ذریعہ گھروں میں غیر ضروری اشیا کی خریداری کا رجحان بہت تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے اور ان سے محرومی کی صورت میں احساس کم تری، آپسی بحث ومباحثہ، لڑائی اور طلاق تک نوبت پہنچ رہی ہے۔ یہ اور اسی قبیل کے دیگر مفاہیم بالواسطہ طور پر اسلامی عائلی زندگی کی فکری بنیادوں کو ڈھانے کا سبب بن رہے ہیں۔

مسئلہ کا حل، تجاویز اور مشورہ

درج بالا بحث اور دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی عائلی نظام مغربی تہذیب وثقافت سے متاثر ہو چکا ہے اور اس کے اندر بھی بہت حد تک وہی جراثیم سرایت کر گئے ہیں جو مغربی عائلی نظام میں پائے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ اور تباہی کے اس طوفان کو کس طرح سے روکا جائے؟ کن اقدامات سے اسے حل کیا جاسکتا ہے؟ ہمیں بحیثیت مسلمان کیا کرنا چاہیے؟ اور کس طریقے سے اس چیلنج کا مقابلہ کرنا چاہیے؟ کیا اسلام اس سلسلے میں کوئی رہ نمائی کرتا ہے؟ ذیل میں اس حوالے سے بعض تجاویز پیش کی جارہی ہیں، جن کے ذریعہ ان مسائل پر یقیناً کافی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے:

☆ مسلمانوں میں اس بات کا شعور پیدا کیا جائے کہ 'اسلامی تہذیب' اور 'مغربی تہذیب' دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، نیز دونوں کے افکار ونظریات اور بنیادی وعملی اساسیات باہم متضاد ہیں۔ اس لیے عائلی نظام زندگی میں مغربی تہذیب کے اصولوں کو کلّی طور پر رد کردینا چاہیے، البتہ اپنی تہذیب وثقافت

کے اصولوں پر چلتے ہوئے مغرب کے تجربات اور وسائل سے مستفید ہونا کوئی حرام اور ناجائز بات نہیں ہے، لیکن اس میں احتیاط لازم ہے کہ ہم مرعوب ذہن کے ساتھ اس کی مکمل اقتدا اور پیروی نہ کرنے لگیں، ورنہ پھر وہی نتائج سامنے آئیں گے جن سے اس وقت مغرب دوچار ہے۔

☆مسلم معاشرے میں ہر شخص/ خاندان تک عائلی نظام زندگی کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کو پہنچانا اور اسے یقین دلانا کہ اسی میں خاندان کے لیے دنیا اور آخرت میں کام یابی مضمر ہے۔اس سلسلے میں سمینار، ورک شاپ، ڈبیٹ، پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا، جاذب نظر تعارفی تمثیلوں اور دیگر ذرائع ابلاغ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے، نیز اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور مساجد وغیرہ میں عائلی نظام کے موضوع پر خطبات کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔

☆مسلم معاشرے میں لڑکے اور لڑکیوں کی مناسب وقت پر شادی کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ ان کی عصمت وعفت محفوظ رہ سکے اور مخلوط تعلیم یا ملازمت کے دوران ان کے بھٹکنے کے مواقع کم سے کم ملیں۔اس سلسلے میں پیش آنے والی رکاوٹوں جیسے جہیز وغیرہ کے خلاف مہم چلائی جائے، کیوں کہ اگر انہیں غیر اخلاقی رشتے قائم کرنے کے مواقع زیادہ اور آسانی سے ملیں گے تو پھر ان کے درمیان خاندانی رشتے کا وجود صرف خام خیالی ہوگی۔

☆مسلم معاشرے میں موجود شادی بیاہ اور اسی طرح کے دیگر معاملات میں غیر ضروری مقامی اور علاقائی رسم ورواج / روایات کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور عورتوں کو اسلام کے عطا کردہ حقوق دیے جائیں۔بعض تنگ نظر مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات جم گئی ہے کہ ان کے دین میں عورتوں کے کوئی خاص حقوق نہیں ہیں، بلکہ بعض فرائض ہیں اور خواتین ان کو پورا کرنے کی ذمہ دار ہیں۔

☆مسلم خواتین کو مغربی تہذیب کے زیر اثر عائلی نظام کی خرابیوں سے واقف کرایا جائے، نیز ان کے سامنے اس سلسلے میں اقوام متحدہ اور اسی طرح کے دیگر عالمی اداروں کے ذریعے عورتوں کو 'مساوات' اور 'آزادی' کے نام دیے گئے 'حقوق' کی حقیقت کو واضح کیا جائے۔مزید برآں ان کی سرگرمیوں، مقاصد، اہداف اور مضر اثرات کو مختلف رپورٹس اور اعداد وشمار کے ذریعے عام کیا جائے۔

☆عورت کے اصل کردار یعنی مادریت (Motherhood) کی اہمیت وافادیت کو معاشرے میں میڈیا اور مضامین کے ذریعے اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے۔قرآن وحدیث نے ماں کے مقام اور درجے کے تعلق سے نہایت اہم باتیں پیش کی ہیں، ان کو دل چسپ انداز میں مسلم خواتین کے سامنے پیش کیا جائے۔

☆ خاندان کے بنیادی عناصر والدین، زوجین اور اولاد کے درمیان تعلق اور رشتہ کم زور کرنے والی خرابیوں اور برائیوں پر غور کرتے ہوئے ان سے اجتناب کیا جائے، تاکہ خاندانی نظام مضبوط ہو سکے۔ خاندان کی اہمیت، ضرورت اور نزاکت سے لوگوں کو واقف کرانے کے لیے ملک کی مختلف تنظیموں اور اداروں کی جانب سے آگاہی مہم چلائی جائے۔

☆ دینی جماعتوں اور تنظیموں کی جانب سے 'خاندان فنڈ' کا آغاز کیا جائے اور اس کا مقصد غریب خاندان کی بہ قدر ضرورت کفالت، گھر بسانے کی خواہش رکھنے والے مرد اور عورت کی قرض حسنہ کے طور پر امداد، بیوہ اور مطلقہ کی دوبارہ شادی کرانا وغیرہ ہوسکتا ہے۔

☆ مسلم نوجوانوں میں مغربی تہذیب کے خطرات، جیسے خاندانی منصوبہ بندی، جنسی بے راہ روی، آزادانہ اختلاط اور نفسیاتی وجسمانی بیماریوں سے واقف کرایا جائے، تاکہ وہ ان سے خود کو محفوظ رکھ سکیں۔

☆ اسلامی میڈیا کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس کے ذریعہ مغربی تہذیب وثقافت اور اس کے عائلی نظام کے نقصانات کو مسلم معاشرے میں تنقیدی نظر سے پیش کیا جائے۔ مزید برآں اسلامی عائلی نظام کی اہمیت، فوائد اور اس کے اخلاقی اقدار کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا جائے کہ انسانیت کی بھلائی اور کام یابی اسی کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ مغربی میڈیا اور اس کے اثرات کو نئی نسل عمداً اور غیر عمداً بہت تیزی سے قبول کر رہی ہے، جس سے ان کے اندر اخلاقی زوال وانارکی پیدا ہو رہی ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ محمد قدری پاشا (1821-1886) مصر کے شہر ملوی (Mallawi) میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار مصر کے بڑے علما اور فقہا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی تعلیم قاہرہ اور مدرسہ الالسنہ سے حاصل کی۔ ملک کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ قاہرہ میں ہی ان کا انتقال ہوا۔ موصوف کی مشہور کتابوں میں الاحکام الشرعیۃ فی الاحوال الشخصیۃ، تطبیق ماوجد فی القانون المدنی موافقا لمذھب ابی حنیفہ، قانون العدل والانصاف فی القضاء علی مشکلات الاوقاف اور مفردات فی علم النباتات ہیں۔

۲۔ ملاحظہ ہو: محمد قدری باشا، الاحکام الشرعیۃ فی الاحوال الشخصیۃ علیٰ مذھب ابی حنیفۃ النعمان، دار ابن حزم، للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت- لبنان

۳۔ اس حوالے سے سموئل فلپس ہننگٹن (Samuel P. Huntington 1927-2008) نے اپنی کتاب The Clash of Civilizations and the Remaking of World

میں تفصیلی بحث کی ہے، ملاحظہ ہو: Samuel P. Huntington, Clash of Civilizations and the Remaking of World Order, Simon & Schuster, Rockefeller Center, 1230 Avenue of the Americas, New York.

۴۔ پروفیسر ثریا بتول علوی، جدید تحریک نسواں اور اسلام، منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور، اشاعت دوم، 2000، ص27

5. Richard G Wilkins, Professor of Law and Director of the World Family Policy Center, Brigham Young University, Utha, America

۶۔ بخاری:7138

۷۔ ابوداؤد:2177، البتہ محدثین نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

8. Edmund Leach, A Runaway World?, Reith Lectures 1967, The British Broadcasting Corporation, 35, Marylebone High Street, London, 1968

9. Linda Nicholson, The Myth of the Traditional Family, Feminism and Families, Edited and with an Introduction by Hilde Lindemann Nelson, Routledge, 29, West 35th. Street, New York, P.27

۱۰۔ النساء:36

۱۱۔ بنی اسرائیل:23-24

۱۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: http://www.seniorindian.com/old_age_homes_list.htm

۱۳۔ الروم:21

۱۴۔ مسلم:1468

۱۵۔ التوبۃ:71

۱۶۔ پروفیسر خورشید احمد، تہذیب، خاندان اور معاشرہ، عورت خاندان اور ہمارا معاشرہ: مسائل اور لائحہ عمل، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳

۱۷۔ بحوالہ مولانا محمد عیسیٰ منصوری، مغرب اور عالم اسلام کی فکری وتہذیبی کشمکش اور مسلم اہل دانش کی ذمہ داری، ورلڈ اسلامک فورم، لندن، طبع اول، ۲۰۰۰ء، ص ۸۹

شخصیات

سید احمد شہیدؒ اور تحریک شہیدین

فواز جاوید خان

شیخ مصطفیٰ محمد طحان لکھتے ہیں: ''اسلامی حکومت میں فکری و سیاسی تنظیموں کا مقصد اسلامی افکار و نظریات کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اور شرعی قوانین کی تبلیغ و اشاعت ہوا کرتا ہے۔ لیکن اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں اسلامی تحریکوں اور تنظیموں کا بنیادی مقصد اسلامی حکومت کا قیام ہے۔''(۱)

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی حکومت کے قیام اور اسلام کی تجدید و اشاعت کے مقصد سے برصغیر میں بے شمار تحریکیں اٹھیں۔ کوئی تحریک کسی خانقاہ سے شروع ہوئی تو کسی کو جدیدیت پسند لیڈروں نے لیڈ کیا۔ کچھ نے اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدو جہد کی تو کچھ نے جمہوریت کو ہی پسند کیا۔ کچھ تحریکات نے اپنے مقصد کو پانے کے لیے جہاد کا نعرہ بلند کیا جب کہ دیگر تحریکات نے فکری جنگ پر ہی اکتفا کیا۔

تحریک شہیدین

ان تمام تحریکات میں مجھے جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تحریک شہیدین ہے۔ تحریک شہیدین کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی شروعات تو ایک مایہ ناز علمی گھرانے سے اور بیعت و خلافت کے ماحول میں ہوئی تھی لیکن یہ تحریک کبھی دقیانوسیت کا شکار نہیں ہوئی۔ تحریک نے ایک طرف جہاں باضابطہ طور پر عرصہ دراز تک جہاد کا علم بلند کیے رکھا وہیں ان کے لٹریچر نے مسلمانوں کو فکری زوال و انحطاط اور پس ماندگی سے نکالنے کا عظیم کارنامہ بھی انجام دیا۔ تحریک شہیدین کے قائدین ہندوستان بھر میں گھوم گھوم کر مسلمانوں کے عقائد کو درست کرنے اور ان کو بدعات و خرافات سے نکالنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے اور امیر المجاہدین مختصر سی فوج لے کر اسلام اور مسلمانوں پر حملہ آور قبائلیوں کو سبق سکھانے میں مصروف تھے۔ خلاصہ یہ کہ اس تحریک نے ہر محاذ پر اسلام اور مسلمانوں کی بیش بہا خدمت کی۔ تحریک میں شامل افراد کی سید شہیدؒ نے ایسی تربیت کی تھی کہ ایک ایک آدمی ہزاروں پر بھاری تھا۔ ان میں قربانی کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ جس شخص نے ایک بار سید شہیدؒ کے

ہاتھ پر بیعت کر لی اس نے بلا جھجک جان و مال سب کچھ تحریک پر نچھاور کر دیا۔

ہزار ہا مجاہدین نے سرحدوں پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا لیکن جذبۂ جہاد ماند نہیں پڑا۔ نہ جانے کتنے حق پرست جیلوں اور اذیت خانوں میں سڑتے رہے لیکن کبھی مقصد کا سودا نہیں کیا۔ تحریک سے تعلق کے جرم میں کتنے ہی بڑے بڑے زمین داروں کا لاکھوں کا سرمایہ ضبط ہو گیا لیکن پھر بھی تحریک کی سرگرمیوں سے باز نہیں آئے۔ (۲) سفر میں ہوں یا حضر میں، مرکز میں ہوں یا جہاد کے لیے سرحدوں پر راتوں میں بلا ناغہ تہجد کا اہتمام، دن میں کسی ایک نماز کے بعد درس قرآن کی مجلس، ہر کام خدا اور رسول کی مرضی کے مطابق، یہ تمام ان کی ایسی صفات تھیں جو انہوں نے سید شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ سے سیکھیں تھیں۔ غرض علامہ اقبالؒ کی زبان میں ۔ ع

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

تحریک شہیدین کی مختصر تاریخ

تحریک شہیدین پر اردو زبان میں اچھا خاصا مواد موجود ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے دو جلدوں پر مشتمل سید احمد شہیدؒ کی سوانح تحریر کی ہے۔ (۳) انھوں نے ہی اپنی مایہ ناز کتاب 'تاریخ دعوت و عزیمت' (۴) میں سید شہیدؒ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ آباد شاہ پوری ایک زبردست انشا پرداز اور تاریخ نگار ہیں۔ ان کی کتاب 'سید بادشاہ کا قافلہ' (۵) بھی تحریک شہیدین کا ایک اچھا تعارف ہے۔ غلام رسول مہر کی کتاب 'سید احمد شہید' (۶) محققانہ طرز پر لکھی گئی ہے اور مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ تحریکی حلقہ سے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی شاہ کار کتاب 'تجدید و احیاء دین' (۷) میں بھی سید احمد شہیدؒ کے حوالہ سے ایک باب باندھا ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے بھی ایک کتاب تحریر فرمائی ہے 'ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک' (۸)۔ برصغیر کے مختلف اصحاب قلم نے بھی اس مضمون پر عربی اور انگریزی زبانوں میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہندوستان کی سرزمین سے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں ایک تحریک نے جنم لیا، اس تحریک کا مقابلہ وقت کی مضبوط ترین عالمی طاقت 'انگلینڈ' سے ہوا۔ اس وقت استعماری طاقتیں پوری دنیا کو آپس میں مل بانٹ کر کھانے کے در پے تھیں۔ انسانیت اپنی پستی کی انتہا پر تھی۔ انسانی خون کی ارزانی کے وہ بدترین دن تھے۔ کوئی بھی ایک مضبوط طاقت ایسی نہ تھی جو ان استعماری طاقتوں کا مقابلہ کر سکے۔ ایسے میں استعماری طاقتوں کو اپنے ناپاک عزائم کو پورا کرنے سے روکنے کا بیڑا کچھ بوریا نشین

حضرات نے اٹھایا جن میں سید احمد شہیدؒ اوران کے ساتھی بھی تھے۔ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کو روکنے کے لیے ان مجاہدین نے بھر پور کوشش کی۔ ایمانی حرارت سے لبریز چند سو دیوانوں کا مقابلہ ایک پوری منظّم فوج بلکہ ایک عالمی طاقت سے تھا۔ ایک طرف جدید ترین ہتھیاروں سے لیس عالمی طاقت جس کے پاس پیسوں کی ایسی ریل پیل کہ جب چاہا جس کو چاہا خرید کر اپنے ساتھ ملا لیا، دوسری طرف خدا پر یقین کرتے ہوئے ایک 'ملنگ' کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنے گھروں سے ہجرت کر کے سرحد پر پہنچ جانے والوں کی مٹھی بھر مفلوک الحال جماعت۔ اس کے باوجود بارہا ایسا ہوا کہ ان چند سو سپاہیوں نے ہزاروں کے لشکر کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ہمیشہ کی طرح اپنوں کی غداری آڑے آ گئی اور منافقت نے انہیں ایسا شدید گھاؤ پہنچایا کہ تحریک کے سرے سے مٹ جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔ ایک مرتبہ تو عین معرکے میں 'امیر المجاہدین' کا آدھے سے زیادہ لشکر دشمنوں سے جا ملا اور گنے چنے افراد ہی امیر کے ساتھ رہ گئے، باقی ماندہ مجاہدین نے بہت ہمت سے کام لیا، لڑتے رہے، قائد سے کیے گئے عہد و پیمان کا دفاع کرتے رہے لیکن ایک ایک کر کے سب شہید ہو گئے۔ خود اس تحریک کے بانی اوران کے بیش تر قریبی جن کی انھوں نے پچھلے دسیوں سال میں تربیت کی تھی، اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ دشمنوں نے جیت کی خوشی میں قتل و غارت گری کا ایسا ننگا ناچ رچا کہ خدا کی پناہ۔ کچھ اکا دکا مجاہدین جو بچ رہے تھے ان کو زندہ جلا دیا۔ تحریک کے مرکز سمیت پوری بستی میں آگ لگا دی۔ ایک تنکا بھی وہاں باقی نہیں بچا۔ حد تو یہ ہے کہ امیر المجاہدین کی لاش تک وہاں سے نہ مل سکی۔

اس قدر درندگی کا مظاہرہ کرنے کے بعد دشمنوں کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ یہ تحریک پھر کبھی دوبارہ جنم لے سکتی ہے۔ لیکن قربان جایئے اس قیادت پر جس نے مجاہدین کی ایسی تربیت کی کہ زمانہ کے کتنے ہی اتار چڑھاؤ آئے لیکن وہ اس تحریک کو نہ اکھاڑ سکے۔ اس سانحہ کے بعد بھی اگلے کم از کم سو سال تک یہ تحریک زندہ رہی اور دشمنوں کے لیے دردِ سر بنی رہی۔ نہ جانے کتنی بار ایسا ہوا کہ دشمن اپنی پوری طاقت و قوت اکٹھا کر کے ان کے مرکز تک چڑھ آیا، مرکز سے زندگی کی ایک ایک رمق گل کر دی لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ان مجاہدین کے حوصلے کبھی پست نہ ہوئے۔ وہ ایک امیر کے شہید ہوتے ہی اگلا امیر منتخب کر لیتے اور جدوجہد جاری رکھتے۔ ایک مرکز اجڑنے پر دوسرا بسا لیتے لیکن مقصد سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ قربان جایئے ایسی تربیت پر کہ سو سال تک ایک کے بعد دوسرا امیر بنتا رہا لیکن کبھی اختلاف و انتشار کی نوبت نہ آئی۔ کیا آپ جانتے ہیں وہ مربی کون تھا؟ وہ سید احمد شہیدؒ تھے جنہیں مبدءِ فیض نے قیادت اور افراد سازی کی بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اللہ سید

شہید کی قبر کو نور سے بھر دے۔

سید شہیدؒ امیر خان کی فوج میں ایک سپاہی کے طور پر تعینات تھے۔ آپ امیر خان کو اسلامی حکومت قائم کرنے پر آمادہ و تیار کر رہے تھے لیکن وہ انگریزوں کے فریب میں آ کر 'ٹونک' کی ایک چھوٹی سی جاگیر پر خوش ہو گیا، مجبوراً سید شہیدؒ کو اس سے الگ ہونا پڑا۔ سید احمد شہیدؒ کے دل میں ایک اسلامی حکومت کا خواب سما گیا تھا۔ وہ اس خواب کی تکمیل کے لیے کوشاں تھے۔ اسی مقصد سے آپ دہلی پہنچے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بیٹوں سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ سید احمد شہیدؒ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے، یہاں سے صدق و صفا کی وہ عظیم داستان شروع ہوئی جو بعد میں 'تحریک شہیدین' کے نام سے مشہور ہوئی۔

گر چہ کہ شاہ ولی اللہؒ کا خاندان خود مرجع الخلائق تھا۔ وقت کے بڑے بڑے علما و فضلا ان کی مجلس میں شامل ہونے کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے تھے لیکن جب شاہ عبد العزیزؒ نے دیکھا کہ ایک بندہ خدا اسلامی حکومت کے قیام اور فریضۂ جہاد کی طرف دعوت دے رہا ہے تو آپ نے اپنے داماد مولانا عبد الحیؒ اور اپنے بھتیجے شاہ اسماعیل شہیدؒ کو سید شہیدؒ کے ساتھ کر دیا۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبد الحیؒ اس دن کے بعد سے ساری عمر سید شہیدؒ کے شانہ بشانہ رہے اور یہ تمام حضرات ساتھ مل کر افراد سازی میں لگ گئے۔ سالوں سال یہ چند درویش ایک علاقے سے دوسرے علاقے، ایک بستی سے دوسری بستی دورے کرتے رہے۔ ایک بستی میں پہنچتے چند دن یا چند ماہ قیام کرتے وہاں ایک ایک شخص کو پکڑ کر سمجھاتے۔ دنیا کی بے مائیگی اور بے وقعتی کا احساس دلاتے۔ اسلام کی بھولی بسری یادیں تازہ کراتے۔ بدعات اور رسوم و رواج کے چنگل سے باہر نکل آنے کی دعوت دیتے۔ سادگی کی زندگی گزارنے پر ابھارتے۔ ساتھ ہی اذکار کی محفلیں بھی منعقد کرتے۔ مختلف اوقات میں نمازوں کے بعد قرآن و حدیث کے دروس دیتے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہیں کے کسی بندۂ خدا کو جس کو اللہ تعالیٰ نور ہدایت سے نواز دیتا، اس علاقے کا ذمہ دار متعین کر کے اگلی بستی کی طرف کوچ کر جاتے۔ (۹) اس طرح خدا کے ان نیک بندوں نے نہ جانے کتنے بھولے بھٹکے بندگانِ خدا کا رشتہ ان کے رب سے جوڑ دیا۔ بے شمار لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور غفلت و گمراہی کی زندگی سے توبہ کر کے ایک نئی زندگی گزارنے کا عزم کر لیتے۔ جو لوگ اس سفر میں آپ کے ساتھ ہو جاتے آپ ان کی خصوصی تربیت فرماتے اور انہیں کار دعوت کو پھیلانے کے لیے دیگر علاقوں میں بھیج دیتے۔ دھیرے دھیرے بہار، بنگال اور حیدر آباد کے علاقوں میں دعوت کا کام تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا اور تحریک کو خاطر خواہ افراد ہاتھ آ گئے۔

۱۸۲۶ء میں سید شہیدؒ نے ہجرت اور جہاد کا اعلان کر دیا۔ اپنے چند ساتھیوں کو ساتھ لیا اور آزاد سرحد کے علاقے میں پہنچ گئے۔ جہاد کا اعلان کرنا تھا کہ آپ کے تربیت یافتہ افراد پورے ملک سے آزاد سرحد کے علاقے میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ آپ کے خلفا اپنے اپنے علاقوں میں ہی رکے رہے اور وہاں سے افراد کو تیار کر کے، ان میں جہاد کی روح پھونک کر آزاد سرحد کے علاقے میں بھیجتے رہے۔ رفتہ رفتہ آزاد سرحد میں چند سو مجاہدین آ کر جمع ہو گئے اور سید شاہ نے باقاعدہ جہاد کا آغاز کر دیا۔

'رنجیت سنگھ' اس وقت سکھوں کا راجہ تھا، اس کے زمانے میں سکھوں کا ظلم عروج پر تھا۔ وہ کسی بھی بستی میں گھس جاتے، مردوں کو تہ تیغ کر دیتے۔ گھر بار کو لوٹ کر اس میں آگ لگا دیتے۔ فصلیں تباہ و برباد کر دیتے اور خواتین کو ساتھ پکڑ کر لے جاتے۔ اس علاقے کے مسلمانوں پر سکھوں کی ایسی دہشت تھی کہ ان کی آمد کا سنتے ہی مسلمان پوری پوری بستیاں خالی کر کے بھاگ جاتے۔ ایسے میں جب سید شہیدؒ وہاں پہنچے تو مجاہدین کو لگا کہ یہ مسلمان سرحدی قبائل جو سکھوں کے ظلم سے عاجز ہیں خود بخود ان کا ساتھ دیں گے، اس لیے سید شہیدؒ نے قبائلیوں کی تربیت میں کچھ زیادہ وقت نہ لگایا اور پہنچتے ہی باقاعدہ جہاد کا آغاز کر دیا۔

سید شہیدؒ کے جانبازوں کے کام یاب حملوں سے ظالموں کی سطوت و شوکت کو سخت ٹھیس پہنچی اور علاقے سے ان کا رعب جاتا رہا۔ مسلمانوں کی اس کام یابی کو دیکھ کر علاقے کے قبائلی سردار بھی سید شہیدؒ کے ساتھ شامل ہونے لگے۔ وہ چند سو لوگ جو سید شہیدؒ کے ساتھ آئے تھے اب اسی ہزار کے آس پاس ہو گئے تھے۔ سید شہیدؒ کو ان نئے آنے والوں کی خاطر خواہ تربیت کا موقع نہیں ملا، یہ لوگ اپنے اپنے سرداروں کے جھنڈوں تلے ہی جہاد کرتے رہے۔ ادھر 'رنجیت سنگھ' نے جب دیکھا کہ یہ طاقت مستقل بڑھتی جا رہی ہے تو اس نے بھی ایک بھرپور جنگ کی تیاری کر لی۔ پہلی بار دونوں فوجیں کھلے میدان میں آمنے سامنے ہوئیں۔ رنجیت سنگھ نے اس دوران پیٹھ پیچھے قبائلی سرداروں کو لالچ دے کر اور ڈرا دھمکا سید شہیدؒ سے بغاوت پر آمادہ کر لیا تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو اسلامی فوج نے زبردست اقدام کیا اور دشمن کچھ ہی دیر میں میدان سے پیچھے ہٹنے لگے۔ اچانک ایک قبائلی سردار جس کے ساتھ بیس ہزار کی فوج تھی میدان چھوڑ کر فرار ہونے لگا، اس کی دیکھا دیکھی باقی قبائلی بھی میدان چھوڑنے لگے۔ ایک ایک کر کے سارے ہی قبائلی سردار اپنی اپنی فوجیں لے کر پیچھے ہٹ گئے۔ میدان میں اب صرف وہی مجاہدین باقی رہے تھے جن کی سید شہیدؒ نے طویل عرصہ تک تربیت کی تھی، اس تربیت کے نتیجے میں وہ ابھی بھی میدان چھوڑنے کے بجائے دشمن کے آگے سینہ سپر تھے۔ ایک بڑی تعداد میں مجاہدین شہید

ہو گئے اور میدان جنگ سکھوں کے ہاتھ رہا۔ یہ قبائلی سرداروں کی پہلی غداری تھی۔ اس کے بعد کی داستان تو غداریوں سے بھری پڑی ہے۔ اس دوران ایک قبائلی سردار 'محمد شاہ' نے جس کو سید شہیدؒ نے ایک بار غداری کرنے پر معاف کر دیا تھا، دوبارہ غداری کی اور دھوکے سے اپنے علاقے میں تعینات سیکڑوں مجاہدین کو مروا دیا۔ غداروں سے پریشان ہو کر سید شہیدؒ نے مرکز بھی بدل لیا لیکن غداری نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ بالآخر ۱۸۳۱ء میں اپنوں کی ہی غداری کے نتیجے میں 'مشہد بالاکوٹ' کا جانکاہ سانحہ رونما ہوا جس میں سید شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور دیگر کتنے ہی ارباب صفا نے شہادت کا جام ہونٹوں سے لگا لیا۔ مشہد بالاکوٹ کے بعد سکھوں کے دربار میں زبردست خوشیاں منائی گئیں۔ ان کو لگتا تھا کہ یہ تحریک اب ہمیشہ ہمیش کے لیے ختم ہو گئی ہے۔ وہ اپنے زعم میں اس تحریک کی راکھ کو بھی دفنا آئے تھے۔

کامیابی کا مفہوم

کامیابی اور ناکامی دو ایسے الفاظ ہیں جن کا ہر کسی کی نظر میں ایک الگ مطلب ہوتا ہے۔ ایک شخص کسی کو بہت کام یاب سمجھ رہا ہوتا ہے جب کہ دوسرا شخص اس کو ناکام ترین گردانتا ہے۔ فلاسفہ اور دانشور حضرات بھی کام یابی کے معنی و مقصود کو لے کر باہم دست بگریباں ہی نظر آتے ہیں۔ ایک دانشور کام یابی کا ایک مفہوم متعین کرتا ہے، اس کے بعد آنے والا اس مفہوم کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے اور ایک الگ مفہوم دے کر چلا جاتا ہے۔

ہر وہ تحریک یا مومنٹ جس سے معاشرے اور سماج کی خیر و سلامتی مطلوب ہو، نیز نظام اسلامی کا قیام مقصود ہو، ایک کام یاب تحریک ہے۔ چاہے وہ اپنے اس مقصد میں جس مقصد کو لے کر وہ اٹھی تھی کام یاب ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، شرط صرف یہ ہے کہ تحریک صحیح معنوں میں اسلام کے متعین کردہ خطوط پر ہی گامزن ہو۔ مثال کے طور پر 'تحریک شہیدین' کا مقصد سرزمین ہند سے غیروں کے تسلط کو ختم کرنا اور علاقائی مسلمانوں کو سکھوں اور انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانا تھا لیکن وہ اپنے اس مقصد میں کام یاب نہ ہو سکی، اس کے باوجود ہماری نظر میں وہ ایک کام یاب تحریک تھی کہ ان کو ابدی زندگی کی کام یابی نصیب ہو گئی۔ سنوسی تحریک (۱۰) کا مقصد لیبیا کی سرزمین پر قابض اٹلی کو وہاں سے نکال پھینکنا تھا لیکن سالہا سال کی جد و جہد کے باوجود وہ اپنے اس مقصد میں ناکام رہے کیوں کہ بالآخر دھیرے دھیرے کر کے پورا لیبیا اٹلی کے قبضہ میں آ ہی گیا تھا، اس کے باوجود ہم سنوسی تحریک کو ناکام تحریک نہیں کہہ سکتے کہ اصل کام یابی تو ابدی زندگی کی کام یابی ہے اور سنوسی تحریک کے مجاہدین یقیناً کام یاب رہے۔

لیکن اس مضمون میں آگے جہاں بھی کام یابی یا ناکامی کا لفظ آئے گا وہ اس معنی میں ہوگا کہ تحریک جس مقصد کو لے کر کھڑی ہوئی تھی، اس مقصد میں کام یاب ہوسکی یا ناکام رہی۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''كَم مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ''(۱۱) ''کہ حکم ایزدی سے بارہا ایسا ہوا ہے کہ چھوٹا گروہ بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔'' ظاہری بات ہے اس آیت کا تعلق اس دنیا میں حاصل ہونے والے غلبے سے ہی ہے۔ سید مودودیؒ اپنی کتاب 'تجدید واحیاء دین' میں لکھتے ہیں کہ ''ان کی ناکامی دنیوی نتائج کے اعتبار سے ہے کہ وہ عملاً جاہلیت کا اقتدار ختم کر کے اسلام کا غلبہ قائم نہ کر سکے۔ اسی کے اسباب کا ہمیں جائزہ لینا ہے تاکہ اقامت دین کی سعی میں ان اسباب ناکامی سے احتراز کیا جاسکے۔''(۱۲) اسی روشنی میں ہم آگے تحریک شہیدین کے تعلق سے گفتگو کریں گے۔

تحریک شہیدین کی ناکامی

تحریک شہیدین کی تمام خوبیاں ایک طرف لیکن بہرحال وہ ایک ناکام تحریک تھی۔ سید شہیدؒ نے تحریک کا جو مقصد متعین کیا تھا (اسلامی حکومت کا قیام)، جس سے متاثر ہوکر شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے بھتیجے (شاہ اسماعیل شہیدؒ) اور اپنے داماد (مولانا عبدالحیؒ) کو آپ کے ساتھ کیا تھا، اس مقصد کو حاصل کرنے میں تحریک آخر تک ناکام ہی رہی۔ سید احمد شہیدؒ یا تحریک شہیدین پر لکھنے والے تمام مصنفین سید شہیدؒ کے سلسلے میں شامل ہیں یا پھر ان کے راست معتقد ہیں۔ اس عقیدت نے انہیں تحریک کی ناکامی سے متعلق گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دی۔ انہوں نے سید شہیدؒ کی زندگی کے دیگر پہلوؤں کو تو بہت تفصیل سے قلم بند کیا ہے لیکن اس موضوع پر خاموش نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر سید شہیدؒ نے ایک غدار کو معاف کر دیا، نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا بلکہ اس پر دوبارہ بھروسہ بھی کرلیا۔ اس غدار نے دوبارہ غداری کی اور ایک بڑی تعداد میں مجاہدین کو شہید کروادیا۔ آبادشاہ پوری اس غدار کو معاف کردینے کو سید شہیدؒ کی نیک نفسی بتاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں (۱۳) جب کہ یہ ایک سیاسی غلطی تھی۔ ایک بدترین سیاسی غلطی۔ یہی غلطی سید شہیدؒ سے پہلے میسور کا شیر بھی کر چکا تھا (ٹیپو سلطان شہیدؒ اور غدار میر صادق)۔ بالآخر اس غلطی نے اس شیر کی بھی جان لے لی تھی کہ سیاسی غلطیاں معاف نہیں کی جاتیں۔

''تاریخ اس وقت تک اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے جب تک کہ اس سے سبق نہ حاصل کرلیا جائے۔''

سید شہیدؒ اور ان کے ساتھی یکتائے روزگار تھے۔ تحریکات اسلامی کے لیے ان سے زیادہ مخلص، باصلاحیت اور باہمت لوگوں کا دست یاب ہونا ناممکن نہ بھی ہو، مشکل ضرور ہے۔ اس کے باوجود وہ ناکام ہوئے۔ اس لیے

ان کی ناکامی کی وجوہات کو سمجھنا اور بھی ضروری ہے۔ سید مودودیؒ تحریک شہیدین کی ناکامی کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ہمارے دل میں قدرتی طور سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی زبردست اصلاحی وانقلابی تحریک، جس کے لیڈر اور کارکن ایسے صالح ومتقی اور ایسے سرگرم مجاہد لوگ تھے، انتہائی ممکن سعی وعمل کے باوجود ہندوستان پر اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ اس سوال کو عقیدت مندی کے جوش میں لاجواب چھوڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ صلاح وتقویٰ اور جہاد کو اس دنیا کی اصلاح کے معاملے میں ضعیف الاثر سمجھنے لگیں اور یہ خیال کر کے مایوس ہو جائیں کہ جب ایسے زبردست متقیانہ جہاد سے بھی کچھ نہ بنا تو آئندہ کیا بن سکے گا؟'' (۱۴)

جلد بازی

نبی کریم ﷺ نے مکہ میں تیرہ سالہ قیام کے دوران صرف ایک کام کیا تھا اور وہ تھا افراد سازی کا کام۔ تحریک میں شامل ہونے والے افراد کی تربیت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام بہت وقت اور بہت محنت چاہتا ہے۔ نبوت ملنے کے بعد آپ ﷺ تقریباً تیئیس سال بقید حیات رہے، جس میں سے تیرہ سال کا وقت افراد سازی میں صرف کیا اور باقی آدھے سے بھی کم وقت میں آپ ﷺ نے ایک بڑی حکومت قائم کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر تمام بادشاہوں اور رؤسا وقبائل پر حجت بھی تمام کردی۔ یہ کیوں کر ممکن ہوا؟ یہ دراصل افراد سازی ہی کا کرشمہ تھا۔ سید شہیدؒ نے دعوت کا کام ہندوستان کے صرف ایک ہی حصہ تک محدود رکھا اور جیسے ہی وہاں سے کچھ افراد میسر آئے آپ ان کو ساتھ لے کر جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ حالاں کہ ہندوستان کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا تھا جہاں آپ کی دعوت اگر پہنچتی تو جتنے لوگ پہلے آپ کے ساتھ تھے اس سے کہیں زیادہ لوگ آپ کے ساتھ ہوتے۔ جہاد اور امارت کا اعلان کرنے کے بعد تحریک نے ایک سیاسی صورت اختیار کر لی جس کی وجہ سے قبل از وقت مخالفتیں بھی شروع ہوگئیں۔ اس جلد بازی سے یہ بھی نقصان ہوا کہ جیسے ہی مجاہدین کی ایک جماعت شہید ہوئی آپ کو ہندوستان سے فوراً نئی کمک کی ضرورت پڑ گئی، اور جو لوگ بعد میں پہنچے ان کی آپ تربیت نہ کر سکے تھے۔ وہ آتے اور جہاد میں شامل ہوتے رہتے، ان میں سے ہی کچھ نے غداری بھی کر دی اور مجاہدین کا قافلہ مخبروں کا شکار ہو گیا۔ آپ کے شہید ہو جانے کے بعد آپ کے ساتھیوں خصوصاً مولانا ولایت علیؒ نے اس غلطی کو سدھارنے کی طرف خاص توجہ دی اور اگلے چند سالوں تک جہاد کے بجائے ہندوستان بھر کے گاؤں اور دیہاتوں میں جا کر افراد سازی میں مصروف ہو گئے۔

ذاتی مفاد کے لیے ساتھ میں شامل ہونے والے قبائل

فتح مکہ سے پہلے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مسلمان بہت کم تعداد میں تھے، بالکل گنے چنے۔ کیوں کہ ہر آن دشمنوں کا خطرہ سر پر منڈلاتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جیسے جیسے مصیبتوں کے یہ بادل چھٹنے لگے اسلام لانے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ حجۃ الوداع کے موقع پر یہ تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ ان میں سے بہت سے وہ لوگ بھی تھے جو کنارے پر کھڑے اونٹ کے بیٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مشرکین مکہ غالب آتے ہیں یا نبی ﷺ کی جماعت؟ فتح مکہ سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ اب جزیرۂ عرب میں مشرکین کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو وہ بھی گروہ در گروہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے تھے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے انتقال کے فوراً ہی بعد انہوں نے شر انگیزی اور فتنہ بازی شروع کر دی۔ کچھ نے کھلم کھلا اپنے مرتد ہونے کا اعلان کر دیا۔ کسی نے زکوٰۃ دینے سے منع کر دیا تو کسی نے اسلام کے جھنڈے تلے جہاد کرنے سے انکار کر دیا۔ غرض یہ کہ نبی ﷺ کی وفات کے فوراً ہی بعد ان مفاد پرستوں کی وجہ سے حضرت ابو بکرؓ پر ایک بڑی آزمائش آ گئی تھی۔

سید شہیدؒ کی تحریک کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ جب آپ جہاد کا اعلان کر کے سرحد آزاد میں پہنچے تو گنے چنے چند لوگ ہی آپ ساتھ تھے۔ جیسے ہی آپ نے سکھوں پر چھاپہ مار کارروائیاں شروع کیں اور کارروائیاں کام یاب بھی رہیں تو علاقائی قبائل کے سردار آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ سید شہیدؒ ہر آنے والے کو اپنے ساتھ شامل کرتے رہے اور جب قبائلیوں کی ایک بڑی تعداد آپ کے ساتھ شامل ہو گئی تو آپ نے سکھوں سے میدان میں ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ آپ کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ قبائلی دراصل وہ مفاد پرست لوگ ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر آپ کے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔ سید شہیدؒ ان کی طرف سے بے خبر رہے اور سکھوں نے اندر ہی اندر ان قبائلی سرداروں سے سانٹھ گانٹھ کر لی۔ جب جنگ شروع ہوئی تو پہلے تو مجاہدین سکھوں کو کھدیڑتے ہوئے دور تک نکل گئے، پھر اچانک رچی رچائی سازش کے تحت قبائلی سردار اپنی اپنی افواج کے ساتھ واپس چلے گئے اور سکھوں نے پلٹ کر حملہ کر دیا، میدان میں اب صرف مجاہدین ہی باقی رہ گئے تھے۔ اس سازش کا شکار ہو کر بڑی تعداد میں ہندوستان بھر سے ہجرت کر کے آنے والے مجاہدین شہید ہو گئے اور تحریک کو زبردست دھچکا لگا۔

انٹیلی جنس کا نہ ہونا

روایت میں آتا ہے کہ ایک صبح مدینہ میں لوگوں نے کچھ شور سنا، وہ گھروں سے نکل کر سرحد کی طرف بڑھے تو دیکھا نبی کریم ﷺ اپنے گھوڑے پر سوار وہاں سے واپس آرہے ہیں۔ نبی ﷺ نے لوگوں کو بتایا کہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ گویا نبی ﷺ عام دنوں میں بھی بالکل چوکنا رہتے تھے۔ غزوہ بدر، غزوہ احد سے لے کر غزوہ خندق تک کوئی ایسی جنگ نہ تھی جس میں مشرکین کے لشکر نے اپنے علاقے سے حرکت کی ہو اور آپ ﷺ کو اس کی فوراً خبر نہ ہو گئی ہو۔ مشرکین کے لشکر کے روانہ ہونے سے پہلے ہی نبی ﷺ کو اس کی اطلاع ہو جاتی تھی۔ دوسری طرف فتح مکہ کے موقع پر نبی ﷺ کفار کے سروں پر جا پہنچے تھے اور وہ اس وقت تک آپ ﷺ کی آمد سے بے خبر ہی تھے۔ نبی ﷺ کو اس کا بھی بجا طور سے علم تھا کہ مدینہ میں منافقین کون ہیں جو عین موقع پر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ کسی بھی نئی تحریک کو جو ہر وقت جنگ کی حالت میں ہو، چوکنا رہنا بہت ضروری ہے۔ جب تحریک چوطرفہ دشمنوں سے گھری ہو، ایسے میں انٹلی جینس کا کمزور ہونا بہت بڑی غلطی ہے اور اس غلطی کا سید شہیدؒ نے بار بار ارتکاب کیا۔ جنگ سے پہلے ہی دشمن قبائلی سرداروں سے سودا بازی کر چکے ہوتے اور سید شہیدؒ کو اس سے بالکل ہی لاعلم ہوتے۔ جنگ شروع ہونے کے بعد پتا چلتا کہ فلاں فلاں سرداروں نے غداری کی ہے اور وہ میدان جنگ سے اپنی اپنی فوج لے کر واپس جا رہے ہیں۔ انٹیلی جنس سسٹم کی اس کمزوری سے جہاں دشمن نے بہت فائدہ اٹھایا وہیں مجاہدین کو ناقابل بیان نقصان بھی اٹھانا پڑا۔

غداروں کی سزا

نبی ﷺ نے جنگوں کے بعد بارہا اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ غزوہ بدر اور غزوہ احد میں تمام قیدیوں کو جان کی امان دے دی گئی۔ فتح مکہ کے بعد تمام مکہ والوں کے لیے عمومی معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ خود یہود کے دونوں قبیلوں بنو قینقاع اور بنو نضیر کو جلا وطن کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ لیکن بنو قریظہ کے ہتھیار ڈالنے کے بعد بھی نبی ﷺ نے ان کے جنگجو مردوں کو قتل کروا دیا۔ کیوں؟ کیوں کہ غداری ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ غداری کی سزا صرف اور صرف موت ہے۔ غداروں کو معاف کرنے کا صاف مطلب اپنے آپ کو ہلاکت کے منھ میں ڈالنا ہے۔ محمد شاہ ایک قبائلی سردار تھا جس نے سکھوں سے ایک جنگ کے دوران سید شہیدؒ سے غداری کی تھی۔ سید شہیدؒ نے جنگ کے بعد اس کے اوپر چڑھائی کر دی۔ وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا تو اس نے سید شہیدؒ سے معافی طلب کی۔ سید شہیدؒ نے اس کو معاف کر دیا اور ایک عالم دین کو ان کا قاضی متعین کر کے، اپنے کچھ مجاہدین کو اس کے علاقے میں الگ الگ جگہوں پر تعینات کر کے خود فوج کے ساتھ واپس آ گئے۔ کچھ دنوں

بعد اس کی نیت میں دو بارہ فتور ہوا اور اس نے نہ صرف یہ کہ اگلی جنگوں میں سکھوں کا ہی ساتھ دیا بلکہ اپنے علاقے میں تعینات مجاہدین اور علما کو بھی سازش کے تحت شہید کروا دیا۔

سلطان ٹیپو شہیدؒ نے بھی یہی غلطی کی تھی۔انہوں نے میر صادق کو غداری میں پکڑے جانے کے بعد بھی بار بار معاف کیا اور آخر کار اسی کی غداری کا شکار ہو کر ٹیپو سلطان اپنی جان سے اور مسلمانان ہند اپنی امیدوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔تاریخ کا بیان ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی نے بھی غداروں کو معاف کرنے کی بدترین سزا بھگتی۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

سمہ کے جن قبائلیوں سے سید شہیدؒ کا معاہدہ ہوا تھا وہاں انھوں نے بہت سے مجاہدین کو الگ الگ چوکیوں اور بستیوں میں تعینات کر دیا تھا۔مجاہدین کی ایک ایسی ہی چوکی تحریک کے دارالحکومت 'پنجتار' سے کچھ فاصلے پر دکھاڑے گاؤں میں تھی۔ایک دن مسجد کے امام صاحب چوکی کے مجاہدین کے امیر سے ملے اور ان کو رازدارانہ انداز میں بتایا کہ علاقے کے قبائلی سرداروں نے غداری کی ہے اور وہ راتوں رات مجاہدین کو مار ڈالنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔چوکی کے امیر شیخ حسن علیؒ نے اپنے بھائی شیخ عبدالعزیزؒ کو فوراً سید شہیدؒ کے پاس بھیجا اور اس خبر کی اطلاع دی۔سید شہیدؒ نے بجائے اس کے کہ معاملہ کی جانچ پڑتال کرتے، شیخ عبدالعزیزؒ کو سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔وہ واپس آئے اور مسجد کے امام صاحب کو بتایا۔امام صاحب کو سید شہیدؒ کی سادگی پر بہت غصہ آیا انہوں دوبارہ قاصد کو روانہ کیا کہ سید شہیدؒ کو بتائیں کہ خبر بالکل پکی ہے، آپ اپنے مجاہدین کو واپس بلالیں لیکن سید صاحبؒ نے دوبارہ ان کو یہ جواب دے کر واپس کر دیا کہ ''شیخ بھائی، یہ بات نا قابل تصور ہے، سراسر غلط معلوم ہوتی ہے۔اس ملک میں رئیس اور قبائلی سردار سب ہمارے ہم نوا ہیں، ہمیں ان سے ہرگز ایسی امید نہیں''۔امام صاحب نے یہ جواب سنا تو کف افسوس ملتے رہ گئے۔بہت کوشش کر کے سمجھا بجھا کر انہوں نے ایک بار پھر قاصد کو سید شہیدؒ کے پاس بھیجا لیکن سید شہیدؒ نے حسب سابق اس بار بھی خبر کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

کچھ ہی روز بعد صبح سویرے ایک قاصد سید شہیدؒ کے پاس پہنچا اور خبر دی کہ محمد شاہ نے غداری کی ہے۔اس نے متعین کردہ قاضی سمیت بہت سے مجاہدین کو شہید کر دیا ہے۔سید شہیدؒ نے فوراً اپنے خاص لوگوں کو بلایا اور یہ طے پایا کہ اپنے تمام مجاہدین کو فوراً مرکز واپس بلالیں۔لیکن وہاں موجود ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ ابھی قاصد کو بھیجنا مناسب نہیں ہے دن چڑھنے کا انتظار کر لیتے ہیں۔صبح ہوتے ہی یہ خبر پورے علاقے میں پھیل گئی اور سید شہیدؒ کے قاصد کے روانہ ہونے سے پہلے ہی دشمنوں کا جاسوس وہاں سے نکلا اور ہر ہر چوکی اور

بستی میں یہ پیغام پہنچا دیا کہ ''سید شہیدؒ نے اپنے مجاہدین کو واپس بلانے کا حکم دے دیا ہے اس لیے آج ہی آج میں ان کا کام تمام کر دو''۔ شام کے وقت یکا یک ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاڑے بجنے لگے۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ جس قتل عام کی سازش کی گئی تھی اسے انجام دے دیا جائے۔ ان سادہ لوح مجاہدوں کو آخر تک بھی کوئی سن گن نہیں ہو سکی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ بالآخر کچھ سیاسی غلطیوں اور ناتجربہ کاریوں کی وجہ سے سیکڑوں مجاہدین اپنی اپنی چوکیوں میں ہی بے دردی کے ساتھ مار دیے گئے۔

سید شہیدؒ کو اس پورے حادثے کی اطلاع ملی تو آپ اس سے شدید متاثر ہوئے۔ منافقوں اور غداروں کی خبر مل جانے کے باوجود سید صاحبؒ اپنی پاک نفسی کی بنا پر ان پر اعتماد کرتے رہے۔ آپ اس علاقے اور وہاں کے قبائلی لوگوں سے بالکل ہی بدظن ہو گئے اور علاقے کو چھوڑ کر ہجرت کرنے کا ارادہ بنا لیا۔ مجاہدین بوجھل دلوں اور شکستہ قوتوں کے ساتھ وہاں سے کہیں اور کے لیے روانہ ہو گئے۔ منزل کا علم نہ مجاہدین کو تھا نہ ہی سید شہیدؒ کو۔ (۱۵)

فتنہ ساز مولویوں کا گروہ

تاریخ نویسوں کا یہ عمومی تاثر ہے کہ عام پٹھان نماز روزے اور دینی جذبات کی حد تک بہت اچھے مسلمان تھے۔ سید بادشاہ کو نگاہِ عقیدت سے دیکھتے تھے۔ ان کی خاصی بڑی تعداد اپنے سرداروں کے معاند رویے کے باوجود، تحریک جہاد سے قلبی وابستگی رکھتی تھی کہ اس نے سکھوں کی طاقت کو پہلی بار کام یابی کے ساتھ چیلنج کیا تھا۔ یہ جذباتی تعلق اتنا گہرا تھا کہ اس کو کاٹے بغیر نفاق کی کام یابی ممکن نہ تھی۔ اس پروپیگنڈے کا سب سے مہلک ہتھیار گور پرست ملاؤں کے وہ فتوے تھے جو بڑی رازداری کے ساتھ قبائل میں پھیلائے جا رہے تھے۔ ملاؤں کے فتوؤں نے عوام الناس کو تحریک اور سید صاحبؒ سے برگشتہ کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ مولویوں کی زبان سے جب ان پر 'منکشف' ہوا کہ سید بادشاہ اور ان کے ساتھی بدعقیدہ اور نئے دین و مذہب کے پیرو ہیں تو وہ سناٹے میں آ گئے۔ دین کے معاملے میں وہ علما پر کامل اطمینان رکھتے تھے۔ وہ یہ تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ 'مقدسین' کا یہ طائفہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ مذہب کے نام پر دھوکہ دے سکتا ہے۔ افترا باندھ سکتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان اور تقویٰ و احسان کے اعلیٰ مدارج پر فائز مجاہدین فی سبیل اللہ کو کافر اور گمراہ قرار دے سکتا ہے۔ سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کے جو مثالی پیکر عام آبادی کی محبت و احترام کا مرکز تھے اس جھوٹے پروپیگنڈے نے اس پر سیاہی پھیر دی۔ پہلے اس کے اندر بیزاری پیدا ہوئی جس نے

رفتہ رفتہ نفرت کی صورت اختیار کرلی اور آخر کار یہ نفرت اشتعال میں بدل گئی۔ اوپر ہم نے مجاہدین کے جس قتل عام کا ذکر کیا ہے اس میں بھی ان مکار ملاؤں کے جھوٹے فتوؤں کا بڑا ہاتھ ہے۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ اسلام کو کبھی باہر کے دشمن اتنا نقصان نہیں پہنچا سکے جتنا کہ خود کو مسلمان کہنے والے منافقوں نے نقصان پہنچایا۔

شہادت کی تمنا میں غیر دانش مندانہ اقدام

سرحد آزاد پہنچ کر سید شہیدؒ نے جو پہلی جنگی کارروائی انجام دی وہ ایک چھاپہ مار کارروائی تھی۔ اس پہلی کارروائی کا امیر جیش 'اللہ بخش خان' کو بنایا گیا۔ سکھوں کے جس ڈیرے پر حملہ کرنا تھا وہاں ایک بڑی تعداد میں سکھ سپاہی موجود تھے۔ اللہ بخش خان نے چند سپاہیوں کو لے کر رات کے آخری پہر میں سکھوں کے پڑاؤ پر حملہ کر دیا۔ سکھ اس اچانک حملہ کے لیے بالکل تیار نہیں تھے وہ ہڑ بڑاہٹ میں اٹھے اور بھاگنے لگے۔ سکھوں نے کسی طرح ایک مہتاب (سرچ لائٹ) جلائی اور ہوا میں بلند کر دی تو ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو کچھ گنے چنے ہی لوگ ہیں۔ وہ مجاہدین کی تعداد ہزاروں میں سمجھ کر بھاگ رہے تھے۔ اب چوں کہ لشکر گاہ میں روشنی ہوگئی تھی اور دن بھی نکلا چاہتا تھا، سکھوں نے پلٹ کر دوبارہ حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور وہ صرف شب خون ہی مارنے آئے تھے، ان کا مقصد بھی پورا ہو چکا۔ اب واپس لوٹ جانے میں ہی عافیت تھی۔ دیر کرنے کی صورت میں دشمن واپسی کے راستے بھی مسدود کر سکتا تھا۔ امیر جیش اللہ بخش خانؒ نے آواز لگائی اور مجاہدین کو لے کر پیچھے کی طرف ہٹنے لگے۔ کچھ جذباتی مجاہدین نے واپسی سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ "ہم نے سید شہیدؒ کے ہاتھ پر شہادت کی بیعت کی ہے ہم اس طرح واپس نہیں جائیں گے"، وہ لوگ مرنے مارنے پر تلے رہے، مجبوراً اللہ بخش خان کو بھی رکنا ہی پڑا۔ کچھ ہی دیر میں اللہ بخشؒ اور ان کے بیش تر ساتھی شہید ہو چکے تھے۔ اب ایک تجربہ کار مجاہد 'اکبر خانؒ' نے دوبارہ آواز لگائی اور مسلمانوں کو پیچھے ہٹنے کو کہا، وہ کسی طرح بچے کچے لشکر کو لے کر سید شہیدؒ کے پاس واپس آگئے۔ جس وقت اللہ بخش خان نے واپسی کے لیے آواز دی تھی اس وقت تک گنے چنے مسلمان ہی شہید ہوئے تھے اور شب خون کا مقصد بھی پورا ہو چکا تھا لیکن کچھ لوگوں کی جذباتیت نے سکھوں کو بدلہ لینے کا موقع فراہم کر دیا اور ستر اسی کے آس پاس مجاہدین شہید ہو گئے۔ (۱۶) شہید ہو جانا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ مقصود تو دشمن پر فتح اور اسلام کا غلبہ ہے۔ اس راہ میں اگر کسی کو قتل کر دیا جاتا ہے تو وہ یقیناً شہید ہوگا۔

قرآن کہتا ہے: "يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ" (۱۷) "وہ راہ خدا میں جنگ

کرتے ہیں پس وہ قتل بھی کرتے ہیں اور ان کو بھی قتل کیا جاتا ہے۔'' ایک مسلمان کو شہید کیا جاتا۔ وہ شہید ہوتا نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے بارہا تحریک شہیدین کو بڑا نقصان پہنچا۔ علامہ اقبالؒ کا یہ شعر بہت بامعنی نہیں ہے۔ ع

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

جنگ موتہ میں مسلمانوں کا مقابلہ اپنے سے کئی گنا زیادہ فوج سے تھا۔ کئی دنوں کی جنگ کے بعد اب یہ لگ رہا تھا کہ جنگ کا اصل مقصد تو حاصل ہو چکا ہے البتہ مزید رکنے کی صورت میں زیادہ جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ 'خدا کی تلوار' نے ایک دانش مندانہ فیصلہ کیا اور انتہائی چالاکی سے اسلامی فوج کو وہاں سے بچا کر واپس نکال لائے۔

بالاکوٹ کی آخری لڑائی (جس میں سید صاحبؒ شہید ہوئے) میں ان کے ایک کمانڈر 'بہرام خان' نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ ''اب جب کہ سکھ مخبری کے ذریعہ ایک خفیہ راستے سے بالاکوٹ پر چڑھ آئے ہیں، تو بالاکوٹ کی ایک ایک پگڈنڈی پر مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ کیوں نہ سکھوں کے کیمپ پر ہی حملہ کر دیا جائے''۔ لیکن بہرام خان کی بات سن کر سید شہیدؒ کہنے لگے کہ ''بہرام، اس بات کو چھوڑیے، اب جو کچھ ہونا ہوگا وہ یہیں ہو کر رہے گا''۔ (۱۸) اگلے دن شام ہوتے ہوتے سید احمدؒ، شاہ اسماعیلؒ، بہرام خانؒ اور بیش تر مجاہدین شہادت کی خلع سے سرفراز ہو چکے تھے۔

اشخاص بمقابلہ اقوام

اب تک جن وجوہات کا تذکرہ ہوا ان کا تعلق افراد سے تھا۔ لیکن تحریک شہیدین کی ناکامی اور انگریزوں کی کام یابی کے پیچھے ایک بیرونی عنصر بھی کارفرما تھا جس کا تفصیلی تذکرہ سید مودودیؒ نے اپنی کتاب تجدید و احیاء دین میں کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جس طرح ہمارے یہاں سے چند افراد ایسے تھے جنہوں نے دانش و بینش سے کام لیا تھا اور بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اس طرح وہاں پوری پوری قومیں یک بستہ کمر باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ (۱۹) وہی دور سائنس کی ترقی اور عروج کا زمانہ تھا۔ ان کی بیداری ہمہ جہت تھی جب کہ ہم صرف ایک میدان میں اپنی ساری محنتیں صرف کر رہے تھے۔ لہٰذا جب دیکھنے والا ان تمام عناصر کو ایک ساتھ دیکھتا ہے تو اس کو سمجھ میں آتا ہے کہ آخر یہ چند افراد اتنی غیر معمولی

صلاحیتوں کے حامل ہونے کے باوجود شکست کیسے کھا گئے۔ کیوں کہ بہرحال یہ عالم اسباب ہے۔ یہاں فیصلے نیتوں کی بنیاد پر کم اور اسباب کی فراوانی کی بنیاد پر زیادہ ہوتے ہیں۔

خلاصہ کلام

تحریک شہیدین کا جو مقصد تھا، اس مقصد کی حصول یابی کے لیے انہوں نے جو طریقہ کار منتخب کیا، اس مقصد کو حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوئے یا نہیں اور اگر ناکام رہے تو اس کی کیا وجوہات تھیں، ان تمام تفصیلات سے قطع نظر، ایک صدی پر محیط برعظیم کی پہلی اسلامی تحریک کی دو بہت اہم خصوصیتیں تھیں۔

(الف) تحریک کے بانی سید احمد شہیدؒ چند سالوں کے اندر ہی شہید کر دیے گئے اور اس کے بعد تحریک مستقل دو محاذوں پر ڈٹی رہی، ایک ملک کے اندر صادق پور کو مرکز بنا کر دوسرے سرحد آزاد میں، بارہا ادھر کے امیر ادھر اور ادھر کے ذمہ دار ادھر منتقل بھی ہوئے۔ لیکن کبھی قیادت یا امارت کو لے کر تنظیم آپسی خلفشار یا ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوئی۔ امیر ہمیشہ شوریٰ کے مشورے سے اور صلاحیت کو واحد پیمانہ بنا کر منتخب کیا گیا، باقی تمام لوگوں نے دل وجان سے امیر کا تاعمر ساتھ دیا اور اس کے ہر حکم پر لبیک کہا۔ چھوٹے بھائی کو امیر چن لیا جاتا تو بڑا بھائی امیر کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ باپ کے مرنے کے بعد بھتیجے کو امیر چن لیا جاتا تو بیٹے کو کوئی جلن نہیں ہوتی، وہ اتنی ہی تن دہی اور ایمان داری سے اپنے فرائض نبھاتا جتنا کہ اپنے باپ کے زمانے میں نبھاتا تھا۔ امارت ایک خاندان سے نکلتی دوسرے خاندان میں چلی جاتی اور کبھی گھوم پھر کر واپس بھی آجاتی لیکن کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ ان کے درمیان امیر بنائے جانے کی صرف اور صرف ایک ہی شرط تھی، امارت کے لیے 'موزوں ترین' ہونا۔ اسی بے لوث قیادت کا نتیجہ تھا کہ بارہا منافقت اور بدعہدیوں کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو جانے کے باوجود بھی تحریک مٹی نہیں۔ ہر افتاد پڑنے کے بعد باقی ماندہ مجاہدین نے ایک نیا امیر منتخب کیا اور اس نو منتخب امیر نے وقت اور زمانہ کے لحاظ سے تحریک کو دوبارہ منظم کیا۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب قیادت بالکل بے لوث ہو اور ذاتی نفع ونقصان سے بہت اوپر اٹھ کر محض مقصد کی خاطر کام کر رہی ہو۔

(ب) ایک بار نہیں بلکہ بارہا ایسا ہوا کہ تنظیم کی بساط سرے سے ہی لپیٹ دی گئی۔ پورے پورے مرکز اور علاقے جلا کر ختم کر دیے گئے۔ بالاکوٹ، اسلام گڑھ، نارنجی، پنجتار، ستھانہ، منگل تھانہ، ملکا اور نہ جانے کتنے مراکز انگریزوں اور سکھوں نے قبائلی سرداروں کو ساتھ ملا کر تباہ و برباد کر ڈالے۔ لیکن وہ ایک چنگاری جو سید شہیدؒ نے ان کے دلوں میں لگائی تھی وہ کبھی سرد نہیں پڑی۔ ان مجاہدین نے ہار ماننا، یا تھک کر بیٹھ جانا تو

سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ حقیقی اور سچے پکے مسلمان تھے، جو باطل کے آگے دب نہیں جاتے، خوف زدہ ہو کر میدان خالی نہیں کر دیتے۔ یہ ہمت وشجاعت، یہ لگن اور یہ مضبوطی اسی وقت ممکن ہے جب افراد کی کما حقہ تربیت کی گئی ہو۔ یہ سید شہیدؒ اوران کے خلفا کی تربیت کا ہی کمال تھا کہ کیسے ہی کٹھن راستے آئے لیکن راہ عزیمت کے ان شہ سواروں نے کبھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ بنا ٹھوس تربیت کے محض جذباتی بنیادوں پر نشو ونما پانے والے کبھی اس قدر حوصلہ منداور اولوالعزم نہیں ہوسکتے۔ ع

عشق بڑھتا رہا سوئے دار ورسن زخم کھاتا ہوا، مسکراتا ہوا
راستہ روکتے روکتے تھک گئے زندگی کے بدلتے ہوئے زاویے

حواشی ومراجع

۱۔ 'القیادۃ فی العمل الاسلامی'، مؤلف: مصطفیٰ محمد طحان، مترجم: محمد سمیع اختر، 'عالمی تحریکات اسلامی کی چند انقلابی شخصیات'، ہلال پبلیکیشنز، 1988، ص18

۲۔ مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی وغیرہ جنہوں نے سیداحمد شہیدؒ کی وفات کے بعد تحریک شہیدین کوسنبھالا دیا وہ تمام دراصل صادق پور کے بڑے بڑے زمین دار حضرات تھے جنہوں نے تحریک کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ سالہا سال تک ان کے گھر ہی تحریک کا مرکز بنے رہے لیکن ایک طویل کشمکش کے بعد انگریز ان کو گرفتار کرنے میں کام یاب ہوگئے۔ ان تمام کو کالا پانی روانہ کردیا گیا۔

۳۔ 'سیرت سیداحمد شہیدؒ'، مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو،

۴۔ 'تاریخ دعوت وعزیمت'، مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو،

۵۔ 'سید بادشاہ کا قافلہ'، آبادشاہ پوری، مکتبہ ذکریٰ، دہلی

۶۔ 'تحریک سیداحمد شہیدؒ المعروف بہ سرگزشت مجاہدین'، غلام رسول مہرؒ، مکتبۃ الحق

۷۔ 'تجدید واحیاءِ دین'، سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور

۸۔ 'ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک'، مولانا مسعود عالم ندوی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

۹۔ امیر المجاہدین مولانا ولایت علیؒ کا ایک نصیحت آموز واقعہ تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ سیداحمد شہیدؒ کی وفات کے بعد مولانا ولایت علیؒ پورے برصغیر میں گھوم گھوم کر دعوت وتبلیغ کا کام کررہے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ مشرقی بنگال کے علاقہ حاکم پور میں جانا ہوا وہاں ایک درزی ملا۔ مولانا اس سے سلام کر کے گفتگو کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے مولانا کی طرف کچھ سکے بڑھاتے ہوئے آگے بڑھ جانے کو کہا۔ مولانا نے جب پھر بھی اس کو گفتگو

کرنے کے لیے آمادہ کرنا چاہا تو وہ مولانا کو مارنے دوڑا لیکن مولانا اس سے بات کرنے پر مصر رہے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ وہ اپنا کام کرتا رہے گا اور مولانا اس کے پاس بیٹھے اس سے بات کرتے رہیں گے۔ مولانا روزانہ اس کی دکان پر بیٹھے رہتے اور اس کو دین وایمان کی باتیں بتاتے رہتے۔ اسی طرح آٹھ مہینے بیت گئے اور وہ درزی اس قابل ہو گیا کہ اپنے علاقہ میں دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری اٹھا سکے۔ مولانا نے پھر ایک دن اسے نصیحت کی کہ ''اس بستی میں ہم نے تمہارے سوا کسی اور شخص پر محنت نہیں کی ہے، اب اس بستی کو سنبھالنا تمہارا کام ہے، اسے ہم تمہارے سپرد کرتے ہیں، تم جانو اور تمہاری بستی۔'' 'سید بادشاہ کا قافلہ'، آبادشاہ پوری، مکتبہ ذکریٰ، 1982، ص ۱۲۸

۱۰۔ سنوسی تحریک کے بانی 'محمد بن علی السنوسیؒ' تھے جنہوں نے 1837ء میں مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی خستہ حالی کے پیش نظر لیبیا اور اس کے اطراف میں ایک تحریک کھڑی کی تھی۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کی تمام ہی عالمی طاقتوں سے پوری ہمت کے ساتھ نبرد آزما رہے۔ 1902-1913 تک سنوسی مجاہدین سہارا کے ریگستان میں فرانسیسی استعمار کے خلاف سد سکندری بنے رہے۔ پہلی عالمی جنگ میں وہ لوگ مصر اور سوڈان جا کر انگریز استعمار کے خلاف محاذ آرا رہے۔ 1923 میں پھر سنوسی مجاہدین عمر مختار شہیدؒ کی قیادت میں اٹلی کے بدنام زمانہ ڈکٹیٹر مسولینی کی فوج سے ٹکراتے رہے۔ غرض یہ کہ وہ خدا کے ایسے بندے تھے جن کی کئی نسلیں ظالم طاقتوں سے مقابلہ آرائی میں لگی رہیں۔

۱۱۔ سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 249

۱۲۔ 'تجدید واحیاء دین'، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ص 87

۱۳۔ 'سید بادشاہ کا قافلہ'، آبادشاہ پوری، 1982، ص 81-72

۱۴۔ 'تجدید واحیاء دین'، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ص 88

۱۵۔ 'سید بادشاہ کا قافلہ'، آبادشاہ پوری، ص 81-72

۱۶۔ محولہ بالا، ص 43-39

۱۷۔ سورۃ التوبۃ، آیت نمبر 111

۱۸۔ 'سید بادشاہ کا قافلہ'، آبادشاہ پوری، ص 22

۱۹۔ 'تجدید واحیاء دین'، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ص 95-92

دو ہم مزاج، عظیم اور رہ نما شخصیتیں

(حضرت موسیٰؑ اور حضرت عمرؓ)

علامہ سلمان العودۃ
تلخیص وترجمہ: برہان احمد

(علامہ سلمان العودۃ کی تحریر: 'بین سیرتین: موسی والعمر' کے خلاصہ سے دونوں تاریخی شخصیتوں میں موازنہ مقصود نہیں ہے، بلکہ امت اسلامی کو ان عظیم ہستیوں کی چند نمایاں خصوصیات سے متعارف کرانا مقصود ہے تاکہ اخلاقی زوال کے اس دور میں دو سنگ میلوں سے زادِ راہ حاصل کیا جا سکے۔ امید ہے کہ قارئین اس تلخیص میں علمی وتحقیقی مقالے کے عناصر کو تلاش کرنے کے بجائے مصنف کے مقصد تحریر پر نگاہ رکھیں گے۔ مدیر)

درحقیقت ایک عظیم شخص وہ ہے، جس کی رفاقت میں ہر ایک اپنی صلاحیت کو محسوس کر سکے، اپنی خوبی تلاش کر سکے، مثبت کام کی پہل کر سکے، خود کی عظمت جان سکے، تاکہ اپنے رہبر کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہو سکے، اپنی صلاحیت کو پیش کر سکے۔ یقیناً حضرت موسی علیہ السلام کی رفاقت نے مصر کی کمزور عوام کو ایک متحد قوت کا احساس دیا، وہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے، فرعون کی خدائی کا انکار کیا، اور ہجرت کر کے نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے، اور ایک غیر آباد سرزمین کو اپنا مسکن بنالیا۔

یہ احساس حضرت عمرؓ کی رفاقت سے بھی دلوں میں جاگ اٹھتا تھا۔ آپ کی فوج نے جب بلاد فارس و بلاد روم کا رخ کیا تو یقیناً ان کے دلوں میں اپنی عظمت کا یہ احساس تھا۔ وہ اپنے خلیفہ کو دیکھ دیکھ ہمت پاتے تھے، ان کی رہ نمائی وہدایات پر دل وجاں سے عمل کرتے تھے، بالآخر اس احساس واس اطاعت نے انھیں فتوحات سے ہم کنار کرایا۔

☆ حضرت موسیٰؑ، عمران کے بیٹے ہیں اور یہ عمرؓ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا لقب 'کلیم' ہے اور حضرت عمرؓ کا لقب 'فاروق' ہے۔

علما بیان کرتے ہیں :اسلامی نظام سیاست میں یہ حکمت اپنائی جاتی ہے کہ جب اس کے اعلیٰ منصب پر فائز شخص ،مزاج کا نرم ہو، تو اس کا نائب سختی کی طرف میلان رکھتا ہو اور اگر ذمہ دار شخص سخت مزاج ہو، تو اس کا نائب نرمی کی طرف میلان رکھتا ہو، تاکہ توازن قائم رہے۔

☆ حضرت موسیٰ حق کے معاملے میں سخت تھے اور ان کے وزیر حضرت ہارونؑ نرم مزاج تھے۔حضرت عمرؓ جو اپنی سخت مزاجی میں معروف تھے، وہ نرم مزاج حضرت ابوبکرؓ کے معاون بنے۔حضرت ابوبکرؓ، حضرت خالدؓ کو ذمہ داری سونپ رہے تھے، جو کہ سختی میں مشہور تھے۔اور حضرت عمرؓ حضرت خالدؓ کو معزول کر کے حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ کو ذمہ دار بنانا بہتر سمجھتے تھے کیونکہ حضرت خالدؓ مزاج کے اسی طرح سخت تھے جس طرح عمرؓ، جب کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ حضرت ابوبکرؓ کی طرح نرم مزاج تھے۔مخلص معمار اور حوصلہ مند نگہباں، حق کے دو اہم ترین ستون ہیں۔ایک حق کے قیام میں کوشاں رہتا ہے، دوسرا اس کی راہ میں حائل دشواریوں کو ہٹاتا ہے، تب جا کر حق کو قیام و دوام نصیب ہوتا ہے۔اس لیے تنظیم ہو، ادارہ ہو، یا ملک کی حکم رانی ہو، یہ توازن برقرار رہنا چاہیے۔

☆ حضرت موسیٰ نے فرعون کا زمانہ پایا اور اس کی تربیت کے سائے میں بڑے ہوئے۔لیکن اس سے ان کی خود اعتمادی کم نہیں ہوئی، نہ انھوں نے خود کو پہچاننے میں غلطی کی اور نہ اپنی ذات کے ساتھ ناانصافی کی۔

حضرت عمرؓ نے اس امت کے فرعون ابوجہل کا زمانہ پایا، وہ آپ کا ماموں تھا، لیکن وہ آپؓ کی آزادمزاجی کو سلب نہ کر سکا اور نہ نئے دین کو قبول کرنے سے روک سکا۔

☆ وہ ایک نبی، معلم، اللہ سے بات کرنے والے ہیں اور یہ سچے، شہید با اثر شخص ہیں۔ان دونوں بزرگوں میں سے ہر ایک پاکیزہ نفس، کشادہ دل اور سادہ مزاج ہیں۔ان کی یہی خوبیاں انھیں حق اور سچائی کی جگہوں پر لے آتی ہیں۔

☆ یہ بلند مرتبت شخصیتیں حوصلہ، عزم، پختگی، طاقت اور سختی میں امتیازی مثال ہیں۔حضرت موسیٰ نے فرعون کو بے باک کہا: ''اے فرعون! میں سمجھتا ہوں کہ تم ضرور ایک شامت زدہ آدمی ہو'' (الاسراء:۱۰۲)

(صلح حدیبیہ کے بعد جب قریش کے حلیف قبیلے نے عہد شکنی کی اور ابوسفیان صلح کی تجدید کرنے کے ارادے سے مدینہ آئے اور حضرت عمرؓ سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ اللہ کے رسول ﷺ کے حضور ان کے لیے سفارش کریں) حضرت عمرؓ نے ابوسفیان کو جواب دیا: ''میں تم لوگوں کی سفارش کروں؟ بالکل نہیں

، بخدا اگر تیر کے ٹکڑے کے علاوہ کچھ بھی مجھے میسر نہ ہو، تب بھی میں اس کے ذریعے تم سے جہاد کروں گا۔"

☆ ان کا نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنی کمیوں کی طرف متوجہ اور اس کی اصلاح کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ نہ منصب کا زعم، نہ بڑکپن کا کبر بلکہ غلطی سرزد ہونے پر اللہ کے خوف سے لرز اٹھتے تھے۔ حضرت موسیٰ عاجزانہ دعا کرتے ہیں: "اے میرے پروردگار! میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرمادے۔" (القصص ۱۶)

گوشہ تنہائی میں حضرت عمرؓ خود سے کہتے ہیں: "خطاب کے بیٹے! مومنین کے خلیفہ! خبردار ہوجا، ہوشیار ہوجا، بخدا اللہ کا خوف ضرور کیا کر، ورنہ وہ تجھے ضرور عذاب دے گا"۔

☆ اللہ کی خاطر غصہ کرتے اور اللہ کی خاطر غصہ پی جاتے تھے۔

قوم کے انحراف کو دیکھ کر حضرت موسیٰ سخت غصہ ہوئے اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی سلیں پھینک دی، جب حالات قابو میں ہوئے، غصہ ٹھنڈا ہوا تو ان کو اٹھایا اور قوم کی فلاح و بہبود کی فکر میں لگ گئے۔

حضرت عمرؓ کی مجلس میں ایک شخص آپؓ کو گالی دیتا ہے اور کہتا ہے: "بخدا کتائی میں سے تم ہمیں نہیں دیتے ہو اور ہمارے درمیان انصاف نہیں کرتے ہو"۔ قبل اس کے کہ آپؓ اس کا محاسبہ کرتے، مجلس میں سے ایک شخص نے یہ آیت یاد دلا دی: "اور جاہلوں سے نہ الجھو۔" (الاعراف ۱۹۹)

اس لیے آپؓ نے اس کی کوئی سرزنش نہیں کی یقیناً آپؓ شریعت کے پاسبان اور اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے۔

☆ قائد کی شرافت، انکساری اور نرم مزاجی اس کی ہیبت، رعب اور باوزن ہونے کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ وہ شریف بھی ہو اور باوزن بھی ہو، فرعون جابر و ظالم ہونے کے باوجود حضرت موسیٰ سے خائف رہتا تھا۔ حضرت عمرؓ کی بارعب شخصیت کا یہ عالم تھا کہ شیطان ان کے سائے سے بھی بھاگتا تھا۔ کفار کے لیڈران اُن سے کتراتے تھے۔

☆ اپنے دروازہ پر پہریدار بٹھا کر اور دوسروں کے احوال سے لا پرواہ ہو کر ان عظیم شخصیتوں نے اپنا رعب قائم نہیں کیا تھا، بلکہ ہمہ وقت دوسروں سے وابستہ رہنے کی وجہ سے خود بخود عظمت قائم ہوگئی تھی۔

حضرت موسیٰ نے دوشیزاوں کو لاچار کھڑا پایا تو خود سے بڑھ کر ان کے لیے کنویں سے پانی نکالا۔ حضرت عمرؓ نے چولہے کی آگ دور سے دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ صاحب آگ سردی اور اندھیرے سے پریشان ہے، بڑھ کر احوال دریافت کئے، ان کے لیے خورد و نوش کا سامان لائے، پھر خود ہی کھیر بنائی، بھوکے بچوں اور اہل خانہ کو پیش کیا، جب کہ خاتون کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کے بچوں کے لیے کھانا بنانے والا

مسلمانوں کا خلیفہ ہے، جس کے نام سے قیصر و کسریٰ ڈرتے ہیں۔

دونوں قائدین مصیبت زدہ، کم زوروں کے لیے بے انتہا نرم مزاج و خاکسار تھے، غرور و تکبر سے پاک دلیری و بیبا کی ان خود دار شخصیتوں کی پہچان تھی۔

☆ان کی زندگی حکمت و دانائی کی چمکتی کہکشاں ہے، جس میں ہمارے حکم راں، ذمہ داران، اصحاب منصب اور عوام دونوں کے لیے کام یاب و مثالی زندگی گزارنے کے رہ نما اصول ہیں، جن سے زندگی سنورتی ہے اور کھوئی ہوئی عظمت بحال ہوتی ہے۔

خبردار! ایسا نہ ہو کہ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں یہ یاد رکھو کہ "موسیٰؑ نے اسے ایک گھونسہ مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔" اور ان کی یہ دعا و احساس ندامت بھول جاؤ "اے میرے رب! میں نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرما دے"۔

ایسا نہ ہو کہ حضرت عمرؓ کا یہ موقف یاد رہے کہ "اگر مجھے صرف تیر کی نوک بھی مل جائے تو میں تم (دشمنوں) سے جہاد کروں گا۔" اور آپؓ کا یہ اسوہ نظروں سے اوجھل ہو جائے کہ "جب وہ سردی اور رات کے اندھیرے میں ایک بھوکی فیملی تک جا پہنچے، خود سامان خورد و نوش بھی فراہم کیا اور اپنے ہاتھوں سے پکا کر بچوں کو کھلایا۔"

ایسا نہ ہو کہ صرف حضرت موسیٰؑ کی طاقت یاد رکھو اور ان کی نرم مزاجی کو بھول جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ حضرت عمرؓ کا حوصلہ یاد رہے اور ان کے انصاف کو فراموش کر دو۔

وہ بازو درحقیقت طاقت ور ہوتے ہیں جو حکمت کے ساتھ حق دلا سکے اور حق لے سکے، وہ کندھے مضبوط ہوتے ہیں جو ذمہ داریوں کا بوجھ حسن تدبیر کے ساتھ اٹھا سکے۔

طب یونانی

ضدی بخار اور اس کا شافی علاج

حکیم شاہد بدر فلاحی

بخار (fever) کسے کہتے ہیں؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ اس کی وجوہات، اسباب اور اس کا علاج کیا ہے؟ ایک معالج کے لیے اس کو سمجھنا بڑا ہی آسان ہوتا ہے اور علاج بھی۔ بخار کے علاج میں بالعموم وہی دافع بخار دوا Paracetamol اور اپنے اپنے تجربہ کے لحاظ سے الگ الگ Antibiotic دوا کا استعمال ڈاکٹر حضرات کرتے ہیں اور آرام سے مطب چلاتے ہیں۔ اس دافع بخار دوا Paracetamol سے شاید ہی کوئی مطب خالی ہو۔

ہم لوگ بھی زمانہ طالب علمی (اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (1991 تا 1996) میں یہی سمجھتے رہے تھے کہ بخار کو اتارنے میں یونانی ادویہ ناکام ہیں۔ قرص حمی وغیرہ کا نام تو سنا اور پڑھا تھا۔ امتحان پاس کرنے کے لیے یونانی نسخے لکھے بھی تھے اور یاد بھی کیے تھے۔ لیکن یقین نہیں تھا کی ہماری یہ ادویہ بھلا بخار کا بخار اتار سکیں گی۔ لیکن جب مطب شروع کیا تو یہ ٹھان لیا کی صرف یونانی ادویہ سے ہی علاج کریں گے، کتابوں کا مطالعہ کریں گے اور دواؤں کو آزمائیں گے۔ ناکامیاں ہمیں مزید کے لیے اکسائیں گی۔ اسی تلاش وجستجو کے ذریعہ بہرحال حسب ذیل نسخہ کے ذریعہ بخار کے علاج میں کامیابی ملی۔ بالعموم وہ مریض جنہیں ٹائیفائڈ (Typhoid) بخار ہے اور وہ انگریزی ادویہ کھا کھا کر تھک چکے ہوتے تھے، محض یہ جوشاندہ (چرائتہ چھ گرام گلو چھ گرام افسنتین چھ گرام، یہ ایک پڑیا ہے) ایسی دس پڑیا پلا دینے سے ہی وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ کسی کو دس پڑیا اور کسی مریض کو بیس پڑیا پکا کر چھان کر پینا ہوتا ہے اور ضعف ونقاہت کو دور کرنے کے لیے خمیرہ مروارید کا اضافہ کر دیتا تھا۔

میں پورے اعتماد سے مطب کر رہا تھا اور الحمدللہ اسی نسخہ سے میرے بخار کے مریض مکمل شفا پاتے تھے۔ اس نسخے نے پچھلے پندرہ سالوں سے کبھی خطا نہیں کیا۔ ایک دن میرے مطب پر ایک مریض آیا۔ یہی کوئی ۲۰

/۲۲ سال عمر رہی ہوگی۔اس نے بتایا کہ وہ موضع چاند پٹی اعظم گڑھ سے آیا ہے۔اسے ہلکا ہلکا بخار پچھلے چار سالوں سے ہر وقت رہتا ہےاور پیٹ میں ہلکی تکلیف رہتی ہے۔کوئی ثقیل غذا کھانے پرمعدہ بھاری ہوجاتا ہے اور متلی آنے لگتی ہے۔(ایسا ایلو پیتھک دوا کے کثرت استعمال سے ہوجایا کرتا ہے۔) کم زوری ونقاہت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔مریض نے بتایا:

> ’’میں پچھلے چار سالوں سے اپنے اس بخار کا علاج کررہاہوں۔جانچ میں ٹائی فائڈ ہی نکلتا ہے۔ڈاکٹر ٹائیفائڈ بخار کا ایک کورس چلاتے ہیں، جب آرام نہیں ہوتا تو کہتے ہیں کہیں اور جاؤ۔میں نے چاند پٹی بازا میں مشہور معالج جناب ڈاکٹر نیاز احمد صاحب کا علاج کرایا۔ علاج میں ناکامی ہونے پراسی بازار میں ایک دوسرے ڈاکٹر جناب ڈاکٹر ابرار احمد فلاحی علاج کرایا۔اس کے علاوہ اعظم گڑھ شہر کے کئی MD ڈاکٹر کے یہاں علاج کیا۔بس وہی وقتی فائدہ بالآخر بغرض علاج میں نے ممبئی کا سفرکیا، وہاں کئی ڈاکٹروں کو دکھایا، جانچ چیک اپ رپورٹ میں وہی ٹائیفائڈ۔لیکن علاج سے کچھ بھی فائدہ نہیں۔تھک ہار کر یونانی علاج کے لیےآپ کے پاس آیاہوں۔‘‘

مریض اپنے ہاتھ میں علاج ومعالجہ کی ایک موٹی فائل لیے تھا۔میں نے ’ھوالشافی‘ لکھ کرحسب ذیل دوائیں دیں: جوشاندہ حمی آدھا گلاس پانی میں پکا کر چھان کرشربت بزوری بیس ملی لیٹر ملا کر پینا ہے۔صبح خالی پیٹ دوبارہ پھروہی پڑیا پکا کرشربت ملا کر پینا ہے۔شام چار بجے اورضعف ونقاہت کودور کرنے کے لیےخمیرہ مروارید ایک چمچہ رات سوتے وقت کھانے کے لیے دیا۔دس دن بعد وہ مریض آیا اور کہا کہ مجھے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا۔میں نے اس کودس دن کے لیے وہی نسخہ پھر سے Repeat کیا۔کیوں کہ کسی کسی مریض کوبیس دن تک بھی پلانا پڑتا ہے۔وہ بیس دن دوا پی کر آیا اور بتایا اسے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا۔مجھے حیرت ہوئی اور میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔تلاش وجستجو نے مجھے نئے دروازوں کوکھٹکھٹانے کے لیے آمادہ کیا۔دوران مطالعہ ’حمی مواظبہ‘ اور’حمی لثقہ‘ سے کافی رہ نمائی ملی۔

حمی لثقہ

لثق کے معنی تری (بلل) کے ہیں۔اس بخار کا نام لثقہ اس وجہ سے رکھا گیا کہ اس کے عوارض میں نرمی پائی جاتی ہے۔جس کو بلغمیت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، صفراوی بخاروں کی طرح حدت وشدت نہیں

ہوتی ۔(ترجمہ کبیر، ج چہارم، ص ۱۲۱)

حمی مواظبہ

وہ عفونی بخار ہے، جس کی باری روزانہ آئے۔اس بخار کا نام مواظبہ اس وجہ سے رکھا گیا کہ یہ ہمیشہ اور ہر روز آتا ہے۔(ترجمہ کبیر، ج چہارم، ص ۱۷۸)

اس بخار میں پسینہ بھی کم نمایاں ہوتا ہے۔ یہ بخار لمبا، دیر پا، مزمن ہوتا ہے اور گاہے چند ماہ تک قائم رہتا ہے۔(ترجمہ کبیر، جلد چہارم، ص ۱۸۰)

حمی لثقہ میں حمی مواظبہ کی ساری علامتیں پائی جاتی ہیں لیکن یہ بخار لرزہ سے خالی ہوتا ہے۔

حمی لثقہ یہ بخار حمی دق سے نہایت مشابہ ہوتا ہے۔اس لحاظ سے کہ اس کی حرارت بھی دق کی طرح زیادہ تیز نہیں ہوتی اور نہ کبھی اترتی ہے۔ بلکہ نرم و دائمی ہوتی ہے اور چھونے والے کو بدن کی حرارت چھوتے ہی معلوم نہیں ہوتی بلکہ کچھ دیر کے بعد جب کہ دیر تک ہاتھ بدن پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔(ترجمہ کبیر، ج چہارم، ص ۱۸۲)

حمی لثقہ و حمی مواظبہ میں یہ فرق ہے کہ حمی مواظبہ پسینہ آکر پورے طور پر اتر جاتا ہے یا اگر پورے طور پر نہیں اترتا ہے تو خفیف سی حرارت باقی رہ جاتی ہے، جسے بخار کا اترنا ہی کہا جا سکتا ہے۔لیکن حمی لثقہ میں ان دو باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں ہوتی ہے۔یعنی نہ تو بخار پورے طور پر اترتا ہے اور نہ ہی ایسی حالت پیدا ہوتی ہے جسے بخار اترنا کہا جائے۔ یہ بخار لرزہ یا سردی سے شروع نہیں ہوتا۔ یہ ایک لازمی بخار ہے جس میں باری نہیں آتی۔(ترجمہ کبیر، ج چہارم، ص ۱۹۶)

اس بخار کے علاج کے ذیل میں حسب ذیل سطور نے نئی راہیں کھولیں:

''ایسے بخار کو روکنے کے لیے مخصوص دوائیں کھلائی جاتی ہیں۔جن کو مانعات حمی اور مانعات حرارت کہتے ہیں۔مثلاً افسنتین، غافث، کرنجوہ، برگ ببول وغیرہ''۔(ترجمہ کبیر، ج چہارم، ص ۱۸۲)

حب کرنجوہ

یہ حب بلغمی بخار میں مفید و مجرب ہے اور بالخاصہ مانع نوبت ہے۔نسخہ: پیپل، مغز کرنجوہ ہر ایک ایک تولہ زیرہ سفید، برگ ببول ہر ایک چھ ماشہ سب کو باریک پیس کر گوندھ کر چنے کے برابر گولیاں بنا کر استعمال کریں۔(ترجمہ کبیر ج چہارم ص 196) میں نے جلدی جلدی کرنجوہ خرید کر توڑ کر اس کا مغز نکالا۔سفوف کیا

اور تنہا کرنجوہ کی ہی بڑی مٹر کی سائز کی گولیاں بنائیں اور جوشاندہ حمی کے ساتھ حب کرنجوہ دو دو گولی صبح خالی پیٹ اور شام چار بجے کھانے کے لیے دیا اور نقاہت کے ازالہ کے لیے خمیرہ مروارید ایک چمچہ رات سوتے وقت کا اضافہ کیا دس دن کے لیے دوائیں دے کر رخصت کر دیا۔ مریض دس دن بعد لوٹا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے کہا کہ اسے بہت آرام ہے۔ اس دس دن میں ایک بار بھی بخار نہیں آیا۔ میں نے انہیں دواؤں کو دس دن کے لیے مزید دے دیا دس دن بعد مریض بہت ہشاش بشاش تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اب الحمدللہ مکمل ٹھیک ہے۔ وہ بخار جو پچھلے چار سالوں سے تھا اب اس مرض سے بالکلیہ نجات مل چکی ہے۔

مجھے میری محنت کا پھل مل چکا تھا لیکن مجھے ابھی اپنے اس نسخہ کو یقینی بنانے کے لیے مزید تجربوں کی ضرورت تھی۔ مجھے اور مریضوں پر اس دوا کو استعمال کرنا تھا کہ ایک دوسرا مریض میرے مطب پر آیا اور اس نے کہا: "حکیم صاحب میں خود پیشہ سے ڈاکٹر ہوں۔ میں نے بی یو ایم ایس بینا پارہ طبیہ کالج اعظم گڑھ سے کیا ہے اور پچھلے پندرہ سالوں سے میں سرکاری ڈاکٹر ہوں۔ مجھے چار پانچ سالوں سے مسلسل ہلکا بخار رہتا ہے جس سے منہ کا ذائقہ کڑوا رہتا ہے، کھانے میں لذت نہیں ملتی۔ پورے بدن خاص کر پنڈلیوں میں درد رہتا ہے۔ رات میں اسی درد کی وجہ سے نیند بہت کم آتی ہے۔ اکثر راتوں میں اٹھ کر اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں کو دباتا ہوں تب کچھ آرام ملتا ہے۔ بہت علاج کیا لیکن یہ ہلکا بخار ساتھ نہیں چھوڑتا اور اب تو تھک ہار کر میں یہ کرتا ہوں کہ Amikasin +Ceftriaxon 1gm ملا کر آٹھ دن وریدی انجکشن لیتا ہوں تو دو ماہ تک بخار سے کسی قدر نجات ملتی ہے لیکن طبیعت تب بھی پوری طرح Fresh نہیں رہتی اور عضلات میں درد تو کسی بھی صورت میں کم نہیں ہوتا۔"

میں نے پورے اطمینان سے جوشاندہ حمی + حب کرنجوہ دو دو گولی صبح خالی پیٹ اور شام چار بجے اور عضلات کے درد کے لیے حب اسگند تین تین گولی صبح شام بعد طعام اور ضعف و نقاہت کو دور کرنے کے لیے قرص جواہر مہرہ دو ٹکیہ صبح خالی پیٹ اور خمیرہ مروارید ایک چمچہ رات سوتے وقت کھانے کی ہدایت کی۔ ڈاکٹر صاحب دس دن بعد دوبارہ مطب پر تشریف لائے۔ وہ بہت خوش تھے۔ دوا استعمال کرنے کے اگلے دن سے ہی انہیں بخار نہیں آیا۔ میں نے یہی دوا انہیں مزید بیس دن کے لیے دی یعنی کل ایک مہینے تک علاج کیا وہ بالکل ٹھیک ہو گیے۔ انہوں نے مطب پر آ کر بتایا کہ انہیں اب دوا کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے میں تو بس

ملاقات کے لیے آیا ہوں۔طب یونانی اس قدر مفید وموثر ہے مجھے کبھی یقین نہیں آ رہا تھا لیکن جس بخار کے علاج میں میں انگریزی دواؤں سے تھک چکا تھا صرف ایک ماہ کے یونانی علاج سے بحمد للہ مکمل ٹھیک ہو گیا۔

میں نے اسی جیسے بخار کو 'ضدی بخار' کا نام دیا ہے اور اس ضدی بخار کا یہی شافی علاج ہے۔اس دوا کا استعمال پورے اعتماد سے جاری ہے۔

ابھی دو ماہ قبل TBMDR(Multidurg resestant TB) مریضہ جس کا بخار اتر ہی نہیں رہا تھا اور کھانسی بھی رک نہیں رہی تھی۔ TB کا مکمل علاج ہونے کے بعد بھی اس کی یہ کیفیت تھی اعظم گڑھ شہر کے مشہور معالج ڈاکٹر سید شہاب الدین MD.MBBS کے یہاں اس کا علاج جاری تھا۔اس مریضہ کے سر پرست میرے مطب پر آئے اور بتایا کہ ہلکا بخار مسلسل رہتا ہے اترتا ہی نہیں اور اسے شدید کھانسی آتی ہے۔ کبھی سوکھی کبھی بلغمی مریضہ کی بھوک بالکل سے غائب ہے۔یہ میرے لیے بالکل نیا کیس تھا اس مریضہ کو TB کا پورا کورس چل چکا تھا، MD ڈاکٹر نے اس کے پرچے پر اوپر ہی TB MDR نمایاں طور پر لکھ رکھا تھا۔(TB MDR is caused by bacteria that is resistant to atleast isoniazed and refampicin) میں نے ابھی تک کسی ایسے مریض کو محض یونانی دواؤں کے سہارے چھوا نہیں تھا لیکن اللہ کا نام لے کر ہمت کر لی۔

هوالشافی

جوشاندہ حمی+حب کرنجوہ دو دو گولی صبح خالی پیٹ وشام چار بجے

سفوف سعال (خود ساختہ) ایک چمچہ+لعوق سپستاں خیار شنبری دو چمچہ+شربت اعجاز دو چمچہ باہم ملا کر چاٹیں صبح دوپہر شام

خمیرہ مروارید ایک چمچہ رات سوتے وقت

دس دن بعد مریضہ کے تیماردار آئے اور کہا کہ اس کی کھانسی مکمل طور ٹھیک ہو گئی اور اب بخار بھی نہیں ہے الحمدللہ_ البتہ بھوک ابھی تک غائب ہے۔میں نے دوبارہ یہ دوا بیس دن کے لیے دی۔اب اسے ہلکی بھوک لگ رہی ہے۔اللہ جانے کیوں میں نے خود سے طے کر لیا کہ انہیں دواؤں کو تین ماہ تک جاری رکھوں گا۔

طبی محققین میرے اس تجربہ سے فائدہ اٹھا کر آگے تحقیق کریں کہ جہاں Isoniazed اور Refampicin جیسی اہم ادویہ ناکام ہو چکی ہوں وہاں حب کرنجوہ اس قدر مفید ہے؟

ایک سات سالہ بچے کو اس کی ماں لے کر آئی اور کہا کہ اس بچے کو ہر وقت بخار رہتا ہے۔ میں نے اس کا علاج بہت کیا لیکن ہلکا ہلکا بخار ہمیشہ رہتا ہے۔ میں نے اس خاتون سے کہا کہ اس مرض کا علاج تو ہے لیکن بچہ چھوٹا ہے اور دوا بہت کڑوی ہے لیکن اللہ کا نام لے کر حب کرنجوہ کی بیس گولیاں دیں اور ایک ڈبہ خمیرہ مروارید۔ اس ہدایت کے ساتھ ایک گولی صبح خالی پیٹ خمیرہ مروارید میں لپیٹ کر کھلائیں اور اسی طرح ایک گولی خمیرہ مروارید میں لپیٹ کر شام کو کھلائیں بچے کو پہلے دس دن میں ہی بخار سے نجات مل گئی، الحمدللہ لیکن میں نے وہی دوا مزید دس دن کے لیے دی بیس دن کے علاج سے بچہ مکمل ٹھیک ہو گیا۔

میرے مخلص اطبا حضرات! میری اس تحریر میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہے۔ میں نے اپنی ایک برس کی انتھک محنت سے جب یہ 'گوہر' حاصل کر لیا تو اسے فوراً سے لٹا دینے کی خواہش ہوئی۔ طب یونانی اور اس سے محبت کرنے والوں سے مجھے محبت ہے اس گوہر کو لٹا دینے کے لیے اس سے بہتر جگہ کوئی اور نہیں ہے۔

اطبا کرام سے میری گزارش ہے کہ ایسے ضدی بخار کے علاج کے لیے حب کرنجوہ بنائیں۔ یہ سستہ، آسان اور موثر علاج ہے۔ اس شافی علاج کو اپنائیں اور خلقِ خدا کو فائدہ پہنچائیں۔

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمیٔ محفل نہیں ہے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے!

علامہ اقبال

استدراک

مولانا محمد عیسیٰ قاسمیؒ

(یہ تحریر ۵؍فروری ۱۹۱۳ء کی ہے۔ راقم کی مرتب کردہ کتاب: تاریخ جامعۃ الفلاح کی اشاعت نومبر ۲۰۱۲ء میں ہوئی۔ جس کا رسم اجراء گولڈن جوبلی کے موقع پر بدست شیخ الجامعہ مولانا سید جلال الدین عمری ہوا۔ جامعہ کے محسن مولانا محمد عیسیٰؒ نے اپنی تحریر کی ایک نقل راقم کو بھی دی۔ ایک نجی ملاقات میں اشاراتی زبان میں مرحوم نے ان نکات پر غور کرنے اور انہیں تاریخ کا حصہ بنانے کی خواہش کی تھی۔ راقم اس تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہے۔ تاہم تاریخ کو اس کے صحیح تناظر میں پیش کرنے کی خاطر مرحوم کی اس قیمتی تحریر کو حیات نو کے صفحات میں قید کررہا ہے۔ مدیر)

مکرمی ومحترمی، جناب ناظم صاحب، نائب ناظم صاحب ومرتب 'تاریخ جامعۃ الفلاح' ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

چند ٹیڑھی میڑھی بے ترتیب باتیں پیش خدمت ہیں۔ اگر مفید پائیں تو لے لیں اور اگر گستاخی محسوس کریں تو درگزر کریں۔ ان باتوں سے نہ تو کسی کی تعریف وتحسین مقصود ہے نہ تنقیص وتحقیر۔ محض اظہارِ حقیقت اور بیانِ واقعہ کے طور پر حاضر ہیں۔ میری کیفیت یہ ہے کہ ع

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

(دایاں ہاتھ مفلوج ہے بائیں سے لکھ نہیں پاتا املا کرانا پڑتا ہے۔)

تاریخ جامعۃ الفلاح، باب دوم، ص ۵۸

’’۱۹۵۹ء تک درجہ پنجم کا آغاز ہو چکا تھا اور کچھ عربی و مذہبی تعلیم بھی داخلِ نصاب تھی۔ ساتھ ہی مدرسہ کا نام بدل کر ’جامعہ اسلامیہ‘ کر دیا گیا۔‘‘

’’ثانوی درجات کے اضافے اور جامعہ اسلامیہ کو بحیثیت ایک اصلاحی، مذہبی و دینی ادارے کی شکل میں منظر عام پر لانے کی تحریک کے آغاز سے متعلق اختلافات پایا جاتا ہے۔‘‘

اس ضمن میں آپ نے بعض حضرات کی روایتوں کا ذکر کیا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے روایت میں درایت سے کام نہیں لیا۔ جس نے جو کہا اسے نقل کر دیا۔ تاریخ کو تاریخ ہی رہنا چاہیے۔ اور روایتوں کی تحقیق و تدقیق اور تنقیح ہونی چاہیے۔ آپ نے صفحہ ۵۹ پر نقل کیا ہے:

ا۔ ’’ماسٹر عبدالجلیل صاحب کے دعوے کے مطابق مدرسہ کی تحریکِ توسیع محترم ڈاکٹر خلیل صاحب کی مرہونِ منت ہے۔ یہ تحریک اس وقت وجود میں آئی جب ڈاکٹر صاحب ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ سے تکمیل کے بعد وطن واپس آئے تھے۔ وطن واپسی کے بعد آپ نے تحریک توسیع کی سرگرمیوں میں بڑی دل چسپی کا مظاہرہ کیا۔ وہ انفرادی طور سے پورے علاقے کے تمام ہی دانش وروں سے بلریا گنج میں دینی وجدید دونوں قسم کی تعلیم کی ترویج و ترقی جیسے مسائل پر بحث و گفتگو کیا کرتے تھے۔ اور فیصلے لیا کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے ادارے کے قیام کے بارے میں فکر مند رہا کرتے تھے، جو دینی وجدید تعلیم کا ایک حسین امتزاج ہو، سنگم ہو۔‘‘

حوالہ آپ نے ڈاکٹر غلام نبی تیلی کے انٹرویو مورخہ ۵/مارچ ۲۰۰۵ کا دیا ہے۔ جس میں مولانا عبدالرؤف صاحب کی آراء کو بھی غلام نبی تیلی نے ملاقات کے بعد درج کیا ہے۔

موضوع بحث

۱۹۵۹ء میں ثانوی درجات کے اضافے اور جامعہ اسلامیہ کو بحیثیت ایک اصلاحی، مذہبی و دینی ادارے کی شکل میں منظر عام پر لانے کی تحریک کے آغاز اور بقول ماسٹر صاحب کے ایک ایسے ادارے کا قیام جس میں دینی اور جدید تعلیم کا ایک حسین امتزاج ہو، سنگم ہو۔

گفتگو ۱۹۵۹ء میں ایک ادارے کے قیام کی ہے۔ ماسٹر صاحب مرحوم ۱۹۵۶ء کی بات کر رہے ہیں جس کا عنوان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ویسے آپ نے ’تاریخ جامعۃ الفلاح‘ کے صفحہ ۵۶ پر ’مدرسہ اسلامیہ‘ کے عنوان کے تحت ۲/جولائی ۱۹۵۶ء کی تاریخ میں جس اشتہار و اعلان کا تذکرہ کیا ہے، جس میں گاؤں کے ہر

چھوٹے بڑے خصوصاً ۵۲ افراد کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ اس میں بقول آپ ۱۳۵ افراد کے مکمل و مختصر دستخط بھی موجود ہیں۔ اس فہرست میں محترم ڈاکٹر خلیل صاحب کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ وہ فہرست یہ ہے:

(۱) حاجی عبدالمجید صاحب (۲) محمد اسحاق صاحب (۳) عبدالجبار صاحب (۴) قمر الدین صاحب (۵) نجب الحق صاحب (۶) بابو مسعود احمد صاحب (۷) محمد فرید صاحب (۸) شیخ ملتان صاحب (۹) شیخ محمد وکیل صاحب (۱۰) عبدالمتین صاحب (۱۱) محمد زبیر صاحب (۱۲) حکیم محمد ایوب صاحب (۱۳) امانت اللہ صاحب (۱۴) شیخ محمد ادریس صاحب (۱۵) حاجی محمد بشیر صاحب (۱۶) ڈاکٹر محمد وکیل صاحب (۱۷) ماسٹر محبوب علی صاحب (۱۸) عبدالرشید خان صاحب (مولوی) (۱۹) شیخ محمد یوسف صاحب (۲۰) شیخ محمد حنیف صاحب (۲۱) میر محمد سعید صاحب (۲۲) مرزا عبدالقدوس صاحب (۲۳) ممتاز احمد صاحب (۲۴) منشی رحمت اللہ صاحب (۲۵) عبدالمجید خان صاحب (قاضی، والد محترم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب: محمد عیسیٰ) (۲۶) محمد مصطفیٰ صاحب (۲۷) محمد الیاس خان صاحب (۲۸) حاجی حسرت خان صاحب (۲۹) مرزا عبدالحمید صاحب (۳۰) نابر علی خان صاحب (۳۱) محمد اکرام پردھان (۳۲) محمد سلیمان خان صاحب (۳۳) محمد عثمان خان صاحب (۳۴) محمد کامل خان صاحب (جھنو) (۳۵) محمد اصغر خان صاحب (۳۶) محمد مبین خان صاحب (۳۷) محمد ناصر خان صاحب (۳۸) حفیظ اللہ خان صاحب (۳۹) عبدالسلام خان صاحب (۴۰) منشی فوجدار صاحب (۴۱) حافظ محمد اسماعیل خان صاحب (۴۲) حاجی عبدالاعلیٰ صاحب (۴۳) محمد رضا خان صاحب (۴۴) محمد مظہر خان صاحب (۴۵) ہدایت اللہ صاحب (۴۶) محمد یوسف خان صاحب (پہلوان) (۴۷) قسمت علی خان صاحب (۴۸) شیخ امجد صاحب (۴۹) شیخ روزن صاحب قصاب (۵۰) شیخ جتن صاحب (۵۱) شیخ دنو صاحب (۵۲) حاجی محمد سلیمان صاحب۔

اگر کوئی اس طرح کی سرگرمی ہوتی جو ماسٹر عبدالجلیل (مرحوم) صاحب بتا رہے ہیں تو قرینِ قیاس تھا کہ ڈاکٹر خلیل صاحب ضرور شریک ہوتے۔ اب دو ہی صورت بنتی ہے کہ یا تو ڈاکٹر صاحب یہاں تھے ہی نہیں یا کوئی سرگرمی نہیں تھی۔

اس رسمی اجلاس میں حسب ذیل اہم فیصلے لیے گئے:

۱۔ ادارے کا نام 'مکتبہ اسلامیہ' یا 'مکتبہ امدادیہ' کے بجائے 'مدرسہ اسلامیہ' رکھا گیا۔

۲۔ دو کمیٹی: ایک انتظامیہ اور دوسری تعلیمی کی تشکیل عمل میں آئی۔ ناظم مدرسہ حاجی عبدالمجید خان صاحب

کو بنایا گیا۔ عاملہ کے لیے: (۱) بابو محمد فرید خان صاحب (۲) عبدالمتین خان صاحب (۳) ماسٹر عبدالمجید خان صاحب (۴) مولوی محمد ابراہیم صاحب (۵) حکیم محمد ایوب صاحب منتخب ہوئے۔

اراکین انتظامیہ کمیٹی کی فہرست میں حسب ذیل لوگ ہیں:

(۱) قمر الدین صاحب (۲) عبدالحمید خان صاحب (قاضی) (۳) عبدالجبار خان (۴) نجب الحق صاحب (۵) اکرام پردھان صاحب (۶) اسحاق خان صاحب (۷) حاجی حسرت صاحب (۸) حاجی بشیر خان صاحب (۹) شیخ ادریس صاحب (۱۰) مرزا عبدالقدوس صاحب (۱۱) امانت اللہ صاحب (۱۲) شیخ ملتان صاحب (۱۳) فوجدار خان صاحب (۱۴) منشی رحمت اللہ خان صاحب۔

اعلان میں لکھا ہے کہ بٹور (میٹنگ) میں تین اہم باتیں رکھی جائیں گی:

۱۔ مدرسہ اسلامیہ کے انتظام چلانے کے لیے انتظامیہ کمیٹی کا بنانا

۲۔ مدرسہ کے لیے مدرس کے چناؤ کے بارے میں سوچ بچار۔

۳۔ اسکول کا تعلیمی نصاب مقرر کرنا۔

آپ نے اسی صفحہ کے نمبر ۵ میں لکھا ہے کہ درجہ سوم کھولنے کا فیصلہ کیا۔ (ص ۵۸)

اس پوری روداد میں کہیں بھی ایک ایسے ادارے کے قیام کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں ملتا جس میں دینی اور جدید تعلیم کا ایک حسین امتزاج ہو۔ اور نہ ہی کسی طرح کی تحریک اور سرگرمی کا پتہ چلتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ماسٹر عبدالجلیل صاحب مرحوم کے ذہن میں یہ بات کہاں سے آئی اور کیوں؟ ہوسکتا ہے کہ ماسٹر صاحب کو اس سرگرمی سے غلط فہمی ہوگئی ہو، جس کا تذکرہ آپ نے صفحہ ۷۱ میں کیا ہے:

> ''مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ وہ درمیانی مدت (۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۱ء) جب جامعۃ الفلاح کی تصویر واضح ہورہی تھی انہی ایام میں گاؤں میں ہائی اسکول کے قیام کی مہم چلی۔ اہل بستی نے اس میں نہایت جوش وخروش سے حصہ لیا۔ اسکول کی عمارت کھڑی کی گئی۔''

یہ مہم دینی وجدید تعلیم کے نہیں تھی بلکہ ہائی اسکول کے لیے تھی۔ میں نے بھی سنا تھا کہ اسکول کی مہم میں گاؤں کے اکثر جدید تعلیم یافتہ لوگ دل چسپی لیتے تھے۔ موضع چھپنہی کے کوئی صاحب کسی مدرسہ کے پرنسپل تھے وہ اس سرگرمی میں بہت زیادہ پیش پیش تھے۔ اور یہ اسکول پرانے چوک کے پچھّم طرف عیدگاہ کے اتر طرف جہاں آج کل شاید 'کنیا پاٹھ شالہ' ہے قائم کیا گیا تھا۔

ممکن ہے کہ غلط فہمی کا یہ سبب ہو کہ ۱۹۵۶ء میں ایک استاد مولوی محمد خلیل صاحب غازی پوری تھے۔ شاید

وہ جماعت اسلامی ہند کے رکن تھے اور بڑے سرگرم اور متحرک استاد تھے۔ بچوں کو وقتاً فوقتاً اے میرے جانباز کھلاڑی والی نظم یاد کرا کر گاؤں کے گلی کوچے میں گشت کرادیا کرتے تھے۔ ماسٹر مرحوم کے ذہن میں ان کی سرگرمیاں محترم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی سرگرمی بن کر بیٹھ گئی ہو۔ ماسٹر عبدالجلیل صاحب مرحوم ہو چکے ہیں ورنہ ان سے تفتیش کی جاسکتی تھی۔

ہاں، محترم ڈاکٹر خلیل صاحب الحمدللہ باحیات ہیں، ان سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۵۹ء میں ثانوی درجات کے اضافے اور جامعہ اسلامیہ کو بحیثیت ایک اصلاحی، مذہبی و دینی ادارے کی شکل میں منظر عام پر لانے کی تجویز گاؤں والوں کے سامنے آپ نے رکھی تھی۔

۲۔ صفحہ ۵۹ پر آپ نے تحریر فرمایا ہے:

> ''جب کہ مفتی عبدالرؤف صاحب کے مطابق جب ۱۹۵۷ء میں بحیثیت استاد ان کا تقرر ہوا تو مدرسہ بس ایک مکتب کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ جہاں ابتدائی درجات کی تعلیم کا نظم تھا۔ اسے مکتب اسلامیہ، مدرسہ اسلامیہ اور جامعہ اسلامیہ کے مختلف ناموں سے جانا جاتا تھا۔ مفتی صاحب کے مطابق قصبہ بلریا گنج کے دانش وروں وذمہ داروں نے مدرسہ کی توسیع کرنے کا فیصلہ لیا۔ مفتی صاحب نے سمجھا کہ مدرسہ کے نصاب میں انگریزی اور جدید مضامین کو داخل کیا جائے گا۔ علم جدید کی اشاعت کے لیے اسے کالج جیسا بنایا جائے گا لیکن مفتی صاحب کو بعد میں معلوم ہوا کہ ذمہ داران اس مدرسہ کو ملک بھر میں اسلامی تعلیم کا ایک ایسا عظیم الشان قلعہ بنانا چاہتے ہیں جو علوم جدیدہ کے پہلو بہ پہلو دینیات کی تعلیم کا بھی گہوارہ ہوگا۔ عمومی لحاظ سے قصبہ بلریا گنج کے تمام ہی باشندگان نے اس مہم میں بڑھ چڑھ کر دل چسپی کا مظاہرہ کیا جن میں ڈاکٹر خلیل صاحب کا نام قابل ذکر ہے۔''

مفتی صاحب ذی استعداد، محتاط، صاف گو، متقی عالم دین ہیں۔ ان سے امید کی نہیں جاسکتی کہ مفتی صاحب جیسا عالم ایسا بیان دے گا جس کا عنوان سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس لیے کی زیر بحث موضوع اسلامی ادارے کے قیام کی تجویز کا ہے کہ کس نے ایسا ادارہ قائم کرنے کی تجویز رکھی جو بقول مفتی صاحب کے 'اسلامی تعلیم کا ایک عظیم الشان قلعہ ہو'۔ مسئلہ ایسے ادارے کی تعمیر وترقی اور اسے بام عروج تک پہنچانے کی جدوجہد اور سعی و عمل میں دل چسپی لینے کا نہیں ہے۔ بفرض محال اگر اس بیان کو مفتی صاحب کا بیان مانیں تو مفتی صاحب غالباً اگست ستمبر ۱۹۵۷ء میں مدرسہ اسلامیہ میں تشریف لائے۔ اور جون یا جولائی ۱۹۵۸ء میں چلے گئے۔ اس

کے بہت دنوں بعد بحیثیت مدرس بلریا گنج میں تشریف لائے۔۱۹۵۸ء میں مدرسہ کی توسیع کی کسی تحریک کا ثبوت نہیں ملتا سوائے اس بات کے جو گاؤں میں ہائی اسکول کے قیام کی مہم چلی۔جس کا تذکرہ آپ نے صفحہ نمبر۱۷ میں کیا ہے۔جانے مفتی صاحب نے کس ادارے کا تذکرہ کیا ہے۔ان کی تحریر سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ غلط فہمی یا خلط مبحث میں مبتلا ہو گئے۔اس لیے کہ وہ 'جامعہ اسلامیہ' کا لفظ استعمال کر رہے ہیں، جب کہ ۱۹۵۷ء،۱۹۵۸ء میں جامعہ اسلامیہ کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔مجھے مفتی صاحب کے بارے میں بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کو ہائی اسکول والی مہم سے غلط فہمی پیدا ہوگئی۔مسئلہ ایک دینی واسلامی ادارے کی تحریک کا ہے۔ جس کے بارے میں مفتی صاحب یہ نہیں فرماتے کہ اس کا محرک کون تھا۔کسی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے سے کسی کا محرک ومجوز ہونا کیسے ثابت ہوسکتا ہے۔ورنہ گاؤں کے تمام باشندگان ادارے کے محرک ومجوز ہوں گے جو ناممکن الوجود ہے۔

''مفتی صاحب کے مطابق قصبہ بلریا گنج کے دانش وروں اور ذمے داروں نے مدرسہ کی توسیع کرنے کا فیصلہ لیا۔'' کن دانش وروں نے؟ کوئی ایک نام لیتے ، یہ فیصلہ کب کیا؟ آگے لکھتے ہیں:

> ''مفتی صاحب کو بعد میں معلوم ہوا۔'' کب معلوم ہوا؟ کس سن میں؟مفتی صاحب نے اس کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی۔مفتی صاحب کا بیان موضوع سے ہٹا ہوا، گنجلک، الجھا ہوا، غیر واضح ہے۔محسوس ہوتا ہے کہ یہ ساری 'کرامات' غلام نبی تیلی سے صادر ہوئی ہیں۔''

۳۔جامعۃ الفلاح کے تاسیسی ممبران میں سے ایک حاجی امانت اللہ صاحب ادارہ کے خاکہ کے ابتدائی نقوش کی وضاحت اور تحریک توسیع دونوں موقع یعنی ۱۹۵۶ء،۱۹۵۹ء حکیم محمد ایوب صاحب سے منسوب کرتے ہیں۔(آپ نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا) غالباً یہ بھی غلام نبی تیلی ہی کے ذریعہ آپ کو معلوم ہوا ہوگا۔

> ''جب کہ ماسٹر جنید صاحب ایک دینی درس گاہ کی تجویز اور اس کی خاکہ کشی کو حاجی محمد اکرام پردھان صاحب سے منسوب کرتے ہیں۔ان کے مطابق مرور زمانہ کے ساتھ اپنے ترقیاتی مقاصد کے حصول سے بہرہ ور ہوتے ہوئے جامعہ جب ۱۹۵۹ء میں داخل ہوا تو اعلان کیا گیا کہ مدرسہ کو جامعہ بنانا ہے جس کے توسط سے اعلیٰ تعلیم کا حصول ممکن ہو سکے۔اس وقت کے ناظم حاجی عبدالمجید صاحب نے انتظامیہ کی ذمہ داری حاجی محمد اکرام پردھان کے سپرد ان الفاظ کے ساتھ کی:''میں اب ایام پیری سے گزر رہا ہوں اور یہ کام روز بروز بڑھ رہا ہے لہٰذا اس کام کو کسی نوجوان، بہادر اور متحرک شخص کے حوالے کر دینا چاہیے۔''

''حاجی محمد اکرام پردھان ہی نے مدرسہ کو جامعہ اسلامیہ کا نام دیا تھا۔جامعہ کے اکاؤنٹ میں انہیں صرف ۱۵ پیسے ملے تھے۔۱۱۵ساتذہ کی ماہانہ تنخواہ ۱۴۶روپے تھے۔''(ص ۶۰)

جامعہ کے تاسیسی ممبر حاجی امانت اللہ صاحب کی بات پر گفتگو بعد میں کروں گا۔ پہلے ماسٹر جنید صاحب مرحوم کے تاثرات پر گفتگو کروں گا۔وہ کہتے ہیں:

> ''جامعہ جب ۱۹۵۹ء میں داخل ہوا تو اعلان کیا گیا کہ مدرسہ کو جامعہ بنانا ہے جس کے توسط سے اعلیٰ تعلیم کا حصول ممکن ہو سکے۔''

جامعہ بنانے کا اعلان کس نے کیا؟ اس کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں کہتے۔اس وقت کے ناظم حاجی عبدالمجید صاحب کے بارے میں کہتے ہیں کہ حاجی عبدالمجید صاحب نے یہ کہتے ہوئے:''میں اب ایام پیری سے گزر رہا ہوں اور یہ کام روز بروز بڑھ رہا ہے لہٰذا اس کام کو کسی نوجوان، بہادر اور متحرک شخص کے حوالے کر دینا چاہیے۔''

کیا حاجی صاحب نے ازخود یہ ذمہ داری اکرام پردھان صاحب کے حوالے کی تھی؟ تو کب؟ حاجی صاحب مدرسہ اسلامیہ کے منیجر تھے۔ظاہر بات ہے کہ انہوں نے مدرسہ اسلامیہ کی ذمہ داری اکرام پردھان کو سونپی ہوگی۔موضوع گفتگو ۱۹۵۹ میں ایک اسلامی ادارے کے قیام کی تجویز کا ہے۔اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ جامعہ کی تحریک و تجویز حاجی اکرام پردھان صاحب نے گاؤں والوں کے سامنے رکھی تھی۔جب کہ صورت واقعہ یہ ہے جیسا کہ آپ نے صفحہ ۶۳ پر تحریر کیا ہے۔'مجلس عاملہ نے اپنی پہلی میٹنگ ۱۵رمئی ۱۹۶۱ء کو منعقد کی۔''

حاجی عبدالقدوس صاحب کو صدر، محمد اکرام پردھان صاحب کو منیجر اور ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کو خازن مقرر کیا گیا۔تعلیمی کمیٹی کے لیے ڈاکٹر وکیل احمد، ڈاکٹر خلیل احمد اور حاجی متین صاحب کو نامزد کیا گیا۔

جب کہ ماسٹر جنید صاحب ۱۹۵۹ء ہی میں حاجی عبدالمجید صاحب کے ذریعہ مدرسہ کی ذمہ داری اکرام پردھان کو دے رہے ہیں۔آپ نے حوالہ ماہنامہ حیات نو۲رمارچ ۱۹۸۷ء صفحہ ۵۵،۵۶ کا دیا ہے۔حیات نو کا اصل مضمون یہ ہے:

(اوپر کی کچھ سطروں کے بعد) جامعہ وقت گزرنے کے ساتھ ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے جب ۱۹۵۹ء میں داخل ہوا۔اور اس نے یہ طے کیا کہ اب اسے مدرسہ سے جامعہ بننا ہے۔اور اس میں اعلیٰ تعلیم کے

مراحل طے کیے جائیں گے تو اس وقت کے موجودہ ناظم حاجی عبدالمجید صاحب مرحوم ومغفور نے یہ ذمہ داری از خود حاجی اکرام صاحب کے حوالے کرتے ہوئے یہ کہا کہ ''میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور کام بڑھتا جا رہا ہے اس لیے یہ کام جواں سال، جواں مرد، دھن کے پکے انسان کے حوالے ہونا چاہیے۔'' اور حاجی اکرام صاحب کے ہاتھوں اس کا نام جامعہ اسلامیہ رکھا گیا۔ انہیں تحویل جامعہ سے کل پندرہ پیسے عطا کیے گئے۔ اس وقت مدرسین کی تعداد پانچ تھی۔ جن کی کل تنخواہ ۱۴۰۶ روپے ماہوار بنتی تھی۔ موصوف مرحوم، ان کے معاون سکریٹری جامعہ جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحب، ان کے ساتھیوں، اساتذہ نیز طلبہ کی کاوشوں سے جامعہ روز بروز ترقی کرتا رہا۔ تین سال بعد 'جامعۃ الفلاح' بن گیا۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ جامعہ کا دستور جامعہ کی باڈی باقاعدہ عمل میں آئی۔

شعبہ نسواں کی ترقی کے پیش نظر موصوف نے اپنا مکان معمولی قیمت کے عوض دے کر خود ایک دوسری زمین پر جا بسے۔''

ماسٹر جنید مرحوم صاحب کا یہ مضمون نہایت الجھا ہوا اور خلط مبحث کا نمونہ ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۱ء، اور ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۵ء سب کو ایک کر دیا ہے۔ ماسٹر جنید صاحب فرما رہے ہیں:

> ''جامعہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے جب ۱۹۵۹ء میں داخل ہوا اور اس نے یہ طے کیا کہ اب اسے مدرسہ سے جامعہ بننا ہے اور اس میں اعلیٰ تعلیم کے اعلیٰ مراحل طے کیے جائیں گے یعنی ۱۹۵۹ء ہی میں مدرسہ اسلامیہ کو ایسی جامعہ بنانے کا جس میں اعلیٰ تعلیم دی جاسکے فیصلہ ہو چکا تھا۔

ماسٹر صاحب آگے ذکر کرتے ہیں:

> ''اس وقت کے موجودہ ناظم حاجی عبدالمجید صاحب مرحوم ومغفور نے یہ ذمہ داری از خود حاجی اکرام پردھان کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ ''میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور کام بڑھتا جا رہا ہے اس لیے یہ کام ایک جواں سال، جواں مرد، دھن کے پکے انسان کے حوالے ہونا چاہیے۔''

ظاہر ہے کام بڑھنے کی بات اسی وقت کہی جاسکتی ہے جب مدرسہ اسلامیہ کو جامعہ اسلامیہ بنانے کی اسکیم منظور ہو چکی ہوگی۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تحریک کرنے والے حاجی عبدالمجید صاحب ہیں یا کوئی اور۔ نہ کہ حاجی اکرام پردھان مرحوم۔ حاجی عبدالمجید مرحوم ۱۹۵۶ء سے شورائی طور پر مدرسہ اسلامیہ کے منیجر منتخب ہوئے

تھے۔ ماسٹر صاحب کہتے ہیں:

''انہوں نے ازخود ذمہ داری اکرام پردھان کے حوالے کردی۔'' یہ بات قرین قیاس نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے:

''مجلس عاملہ نے اپنی پہلی میٹنگ ۱۵رمئی ۱۹۶۱ء کو منعقد کی۔ حاجی عبدالقدوس صاحب کو صدر، محمد اکرام پردھان صاحب کو منیجر اور ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کو خازن مقرر کیا گیا۔''

رہی حاجی محمد اکرام پردھان کی ذات تو وہ بڑے نرالے اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ بقول ماسٹر جنید صاحب کے حاجی اکرام پردھان صاحب مرحوم تنہا ایک انجمن تھے۔ آپ خوش مزاج، بچوں میں بچے، بوڑھوں میں بوڑھے اور جواں سالوں میں جوان رہتے تھے۔ آپ ایک معمولی کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اور کمسنی میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے آپ کی تعلیم بھی مکمل نہ ہوسکی۔ آپ معمولی تعلیم یافتہ تھے۔ بمشکل اردو پڑھتے اور دستخط وغیرہ کر لیتے تھے۔'' حاجی اکرام پردھان صاحب میں اس کے علاوہ بھی بہت خوبیاں تھیں۔ خیر خواہی، لوگوں سے ہمدردی اور اجتماعی ورفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا وغیرہ۔ انہی اوصاف کی بنا پر انہیں گاؤں والوں نے پردھان بنایا تھا۔ اور ۱۹۶۱ء میں انہیں جامعہ اسلامیہ کا منیجر بنایا گیا۔

مرحوم میں کوئی علمی وفکری صلاحیت نہیں تھی۔ نہ ان کا مزاج اور ذوق علمی تھا۔ نہ وہ تحریک کے آدمی تھے کہ کسی ادارے کی تجویز رکھتے اور تحریک کرتے یا کسی ادارے کا کوئی نام رکھتے۔ وہ بے چارے تو شاید 'جامعہ اسلامیہ' کا صحیح مفہوم بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے رہے ہوں گے۔ ان کے منیجر بننے سے پہلے ہی مدرسہ اسلامیہ کا نام جامعہ اسلامیہ رکھا جا چکا تھا۔ اب ماسٹر جنید مرحوم کا یہ کہنا کہ انہوں نے مدرسہ کو جامعہ اسلامیہ کا نام دیا عقل وقیاس اور سمجھ سے پرے ہے۔ تاریخ کے مرتب سے تھوڑی سی چوک ہوگئی ہے۔ اگر وہ اس پرچے 'حیات نو' کے صفحہ ۶۴ پر 'جامعۃ الفلاح کے سابق ناظم انتقال کر گئے' والے عنوان پر نظر ڈالتے تو مضبوط دلیل مل جاتی۔ مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی صدر جامعہ نے اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ''جامعہ کی تاریخ میں یہ دن بڑا کرب انگیز ہے۔ یہ دن جامعہ کے 'اولین بانیوں' میں سے ایک فرد کی رحلت کا دن ہے۔ یہ جامعہ انہیں کا خواب ہے۔'' بانی ایک ہی ہوسکتا ہے، بانیوں کہاں؟

''ناطقہ سربہ گریباں ہے اسے کیا کہیے''

اسی میں ماسٹر جنید مرحوم نے فرمایا کہ ۱۹۵۹ء میں انہوں نے جامعہ کی نظامت سنبھالی اور بڑی خوش

اسلوبی سے اسے نبھایا۔ آپ نے نظما کی جو فہرست دی ہے وہ یہ ہے:

عبدالمجید خاں مرحوم ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۰ء مدرسہ اسلامیہ بلریا گنج، جناب اکرام پردھان صاحب ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۳ء مدرسہ اسلامیہ، جامعہ اسلامیہ، جامعۃ الفلاح۔ (بحوالہ، حیات نو مارچ ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۷)

۴۔ اب رہی حاجی امانت اللہ صاحب کی بات کہ وہ ادارے کے خاکے کی ابتدائی نقوش کی وضاحت اور تحریک توسیع کے دونوں موقع یعنی ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۹ء حکیم محمد ایوب صاحب سے منسوب کرتے ہیں۔

حاجی صاحب کا یہ بیان مجمل اور غیر واضح ہے۔ ۱۹۵۹ء میں توسیع کا مسئلہ نہیں تھا۔ ایک جامعہ کے قیام کا مسئلہ تھا اور رہی بات ۱۹۵۶ء کی تو مکتبہ اسلامیہ میں مزید درجات کے اضافے کی بات تھی۔ ۱۹۵۶ء تک یہ مکتب دوم تک تھا، جو پہلے سے قائم تھا۔ اس میں حکیم صاحب مرحوم نے تن من دھن سے حصہ لیا ہوگا۔ ۲۰ر جولائی ۱۹۵۶ء کو جو اعلان ہوا تھا جس کا تذکرہ آپ کر چکے ہیں اس اعلان سے یہ نہیں ظاہر ہوتا ہے کہ اعلان کس نے کرایا؟ ظاہر بات ہے کہ اعلان اس وقت کے مکتبہ اسلامیہ کے منیجر نے کرایا ہوگا۔ یا پھر اس شخص نے جس نے اسے تحریر کیا۔ رہا ۱۹۵۹ء میں حکیم محمد ایوب مرحوم کی تحریک کا معاملہ تو واقعہ ہے کہ حکیم محمد ایوب مرحوم نے اس طرح کے کسی اسلامی ادارے کے قائم کرنے کی نہ تجویز رکھی اور نہ ہی تحریک کی۔ ہاں حکیم محمد ایوب صاحب ہی وہ پہلے شخص ہیں جب ان کے سامنے میں نے بلریا گنج میں ایک اسلامی ادارے کا منصوبہ رکھا تو انہوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا کہ تحریک کریں میں ساتھ دوں گا (مفہوم)۔ جس سے میں نے حوصلہ پا کر گاؤں والوں کے سامنے ایک اسلامی ادارے کا منصوبہ رکھا۔

دوسرے شخص محترم ڈاکٹر خلیل صاحب ہیں۔ جن کے سامنے میں نے اپنا منصوبہ رکھا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تائید کروں گا (مفہوم)۔ لیکن جب گاؤں کی میٹنگ میں میں نے اس منصوبے کو پیش کیا تو ڈاکٹر صاحب بجائے تائید کرنے کے خاموش رہے۔ میٹنگ کے دوسرے روز میں نے شکایتاً ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے تو مجھ سے تائید کرنے کا وعدہ کیا تھا اور خاموش رہے! اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ کیا میٹنگ کا حال دیکھ نہیں رہے تھے (مفہوم)؟ آپ نے ثانوی درجات کے اضافے اور جامعہ اسلامیہ کو بحیثیت ایک اصلاحی، مذہبی، دینی ادارہ کی شکل میں منظر عام پر لانے کی تحریک کے آغاز سے متعلق ان چار خیالات کو پیش کیا ہے، جن کے وقوع پر میں نے تبصرہ کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے خیالات غلام نبی تیلی کے ہیں۔

۵۔رہی پانچویں بات، آپ نے صفحہ ۵۸، ۵۹ پر ماسٹر محمد عارف صاحب کے حوالے سے مدرسے کی تحریک کے بارے میں کی ہے۔طرز بیان اور بعض الفاظ کے رد و بدل کے بعد مفہوم و معنی کے لحاظ سے صحیح ہے۔مثلاً ماسٹر صاحب نے لفظ ’ایک جھونپڑی‘ استعمال کیا ہے۔ میں نے ’چھپّر‘ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ آخری پنچایت میٹنگ پچھم محلّہ چوک کے پاس ہوئی تھی۔اور اس پنچایت میں جب میں نے اپنا منصوبہ رکھا تو اس کے جواب میں عبدالجبار خان کھیانے کہا کہ ’’منصوبہ کی اچھائی میں شبہ نہیں لیکن اس سے پہلے بھی کہا گیا تھا اور آج بھی کہ ہماری سیران (استطاعت) سے باہر ہے‘‘۔ میں نے کہا: ’’آپ حضرات ایک اسلامی ادارہ قائم کرنے کی اجازت دیجیے اور ایک چھپّر کا نظم کر دیجیے اور پنجم کے بعد سارے مصارف کا ذمہ دار میں رہوں گا۔‘‘ اس پر لوگوں نے کہا کہ ’’یہی کرنا تھا تو پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔‘‘

نام کی تبدیلی

نام کی تبدیلی کے ضمن میں آپ نے صفحہ ۶۸، ۶۹ پر درج کیا ہے:

مولانا شبیر احمد فرماتے ہیں:

’’سب سے پہلے میں نے مدرسہ کو جامعہ اسلامیہ کا نام دیا اور جون ۱۹۶۲ء تک یہ جامعہ ہی کے نام سے موسوم رہا......۔‘‘

مولانا شبیر احمد مرحوم ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ تدریس کے لیے تشریف لائے۔ اس سے پہلے ہی ’مدرسہ اسلامیہ‘ کا نام ’جامعہ اسلامیہ‘ رکھا جا چکا تھا۔ جیسا کہ آپ کی مرتبہ تاریخ گواہی دیتی ہے۔ ’’۶ رنومبر ۱۹۶۰ء بروز اتوار‘ جامعہ اسلامیہ بلریا گنج میں دینی تعلیمی کونسل کی ایک عام میٹنگ منعقد کی گئی۔ (ص ۶۱) ۱۹۵۹ء تک درجہ پنجم کا آغاز ہو چکا تھا اور کچھ عربی و مذہبی تعلیم بھی داخل نصاب تھی۔ ساتھ ہی مدرسہ کا نام بدل کر جامعہ اسلامیہ کر دیا گیا۔ (ص ۵۸)

مولانا شبیر صاحب جامعہ میں اپنے تقرر کے بارے میں خود ہی فرماتے ہیں:

’’مدرسۃ الاصلاح سے اخراج کے بعد جامعۃ الفلاح میں مولانا عبدالحسیب صاحب بحیثیت استاد ایک یا دو مہینہ ہی رہے ان دنوں ہی اعظم گڑھ میں جماعت اسلامی کے اعلیٰ تعلیمی ادارے کی حیثیت سے جامعۃ الرشاد کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مدرسہ کو تحریک اسلامی کے ممبران کا مکمل تعاون حاصل تھا اور مولانا مجیب اللہ صاحب بھی جماعت اسلامی کے ممبر تھے۔ انہیں کے مستقل اصرار پر مولانا عبدالحسیب صاحب جامعۃ الرشاد منتقل ہو گئے۔ اس وقت میں بہار

کے پورنیہ ضلع میں ایک مدرسہ کے اندر استاذ تھا۔خبر ملنے پر میں نوکری کی تلاش میں اعظم گڑھ آیا تھا۔خوش قسمتی سے جماعت اسلامی کی ضلعی میٹنگ اشرف پور میں منعقد ہونے والی تھی، میں نے اس میں شرکت کی۔ جامعۃ الرشاد میں اپنی تقرری کی سفارش پر میرے استاذ مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب ناظم ضلع نے مجھے مشورہ دیا کہ جامعۃ الرشاد کے بجائے بلریا گنج کا مدرسہ میرے لیے زیادہ موزوں ہوگا۔پھر انہوں نے حکیم محمد ایوب وعیسیٰ صاحبان سے میرا تعارف کروایا اور میں بلریا گنج آ گیا۔''

مولانا شبیر صاحب مرحوم کے بیان اور واقعہ میں کوئی مطابقت اور توافق نہیں ہے، تضاد ہے۔تعجب ہے کہ اتنی کھلی حقیقت پر آپ کی نظر نہیں پڑی۔

مولانا شبیر صاحب مرحوم کی نظم غلط چھپ گئی ہے۔صحیح کر دیجیے۔

جامعہ اسلامیہ سے جامعۃ الفلاح

مولانا شبیر صاحب فرماتے ہیں:

''سب سے پہلے......رہا۔۲۰رجون ۱۹۶۲ء کو مجھے ایک موقع ملا۔ مجھے صدر اور ڈاکٹر خلیل صاحب کو ناظم مقرر کیا گیا۔سوال ہمارے سامنے یہ تھا کہ فارغین جامعہ کس نام سے منسوب ہوں گے۔ میرے سامنے اس سلسلے میں کئی نام آئے لیکن بالآخر میں نے ۱۹۶۳ء کی سالانہ رپوٹ جامعۃ الفلاح کے نام سے شائع کی۔تبھی سے جامعہ اسلامیہ کو جامعۃ الفلاح کہا جانے لگا۔''(ص۵۹)

دوسری طرف مفتی عبدالرؤف صاحب مبارک پوری کو قول مذکور سے اختلاف ہے۔وہ کہتے ہیں:

''ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نے مجھ سے ایک بار اس ادارہ کے لیے نام تجویز کرنے کو کہا جس سے طلبہ منسوب کیے جائیں۔ میں نے انہیں دو نام دیے: جامعۃ الفلاح اور فلاح دارین۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا دونوں نام طویل ہیں، میں نے کہا دونوں صورتوں میں فارغین اپنے نام کے بعد فلاحی لکھ سکتے ہیں۔اس طرح مجلس انتظامیہ کی میٹنگ میں جامعۃ الفلاح کا نام شرف قبولیت سے نوازا گیا۔(ص۶۹)

میں نے جو یہ کہا تھا کہ جامعۃ الفلاح کی تجویز مولانا عبدالرؤف صاحب مرحوم نے کی ہے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مولانا راست باز، حق گو اور محتاط عالم تھے۔انہوں نے کسی نشست میں مجھ سے کہا تھا کہ جامعۃ الفلاح

نام کی تجویز میں نے رکھی ہے۔ میں اس وقت یہاں موجود نہیں تھا جب جامعۃ الفلاح نام رکھا گیا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ مولانا عبدالرؤف صاحب مرحوم بھی نہیں تھے۔ ہاں آمد ورفت تھی۔

محمد عارف خان کے مطابق یہ نام مولانا شبیر احمد اصلاحی نے تجویز کیا تھا۔

چوں کہ مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ لہٰذا اس ادارہ کی انفرادیت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مولانا شبیر احمد صاحب اصلاحی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ادارہ کا نام ایسا ہو جس سے فارغین جامعہ خود کو منسوب کر سکیں اور ان کی تشخیص (تشخص) ممکن ہو سکے۔ ۷ ار دسمبر ۱۹۶۲ء کو مولانا کے مشورہ پر ممبران نے اتفاق کر لیا اور مدرسہ کا نام 'جامعۃ الفلاح' رکھا تھا۔'' (ص ۷۰)

یہ بات قرین قیاس ہے اس لیے کہ ۱۹۶۲ء میں مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب اور مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی کا بیان جسے آپ نے صفحہ ۷۰ پر نقل کیا ہے جو یہ ہے:

> ''ڈاکٹر خلیل صاحب مسئلہ زیر بحث کے بارے میں فرماتے ہیں: ۱۹۶۲ء میں میٹنگ کے اندر یہ سوال اٹھا کہ ادارہ کا کوئی ایسا نام ہونا چاہیے جس سے فارغین خود کو منسوب کر سکیں۔ مجھے یاد نہیں کہ موجودہ نام کی تجویز کس نے پیش کی تھی۔ لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم اس وقت قصبہ کی مغربی مسجد میں اسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں کسی نے قدافلح المومنون قرآن کی آیت تلاوت فرمائی اور 'فلاح' نام کی تجویز پیش کی۔''

اسی سلسلے میں مولانا ابوبکر اصلاحی کا بیان درج ذیل ہے:

> ''ہم یعنی ڈاکٹر خلیل احمد صاحب، مولانا حبیب اللہ صاحب اور میں بازار والی مسجد میں تھے۔ عصر کی نماز سے فراغت کے بعد ہم لوگ جس وقت صحن سے گزر رہے تھے میں نے 'قدافلح المومنون' آیت تلاوت کی اور کہا کہ مدرسہ کا نام 'جامعۃ الفلاح' ہونا چاہیے۔ مولانا حبیب اللہ نے میری تائید کی اور اس طرح سے ادارہ کا نام 'جامعۃ الفلاح' پڑا۔''

ان دونوں بیانوں میں رنگ آمیزی اور افسانوی طرز محسوس ہوتا ہے اور تضاد بھی۔ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کہہ رہے ہیں کہ قصبہ کی مغربی مسجد مولانا ابوبکر صاحب کہہ رہے ہیں کہ بازار والی مسجد۔ ایک پچھّم اور ایک پورب۔

۱۹۶۲ء میں افضل حسین صاحب قیم جماعت اسلامی کی زیر رہنمائی جامعہ اسلامیہ بلریا گنج میں اساتذہ کے ٹریننگ کیمپ کا نظم کیا گیا تھا۔ جس میں مختلف مکاتب اسلامیہ کے اساتذہ مثلاً مولانا اقبال صاحب قاسمی (کوہنڈہ)، ماسٹر جمال الدین صاحب (برہڑیاں)، ماسٹر مرسلین صاحب (لار) وغیرہ نے شرکت کی

تھی۔ افضل حسین صاحب مرحوم نے ہم لوگوں کو اپنی کتاب 'فن تعلیم وتربیت' کی مدد سے اصول تدریس، طریقۂ تعلیم، نظم مدرسہ اور نفسیات وغیرہ پر درس دیا تھا۔ اور عملی مشق بھی کرائی تھی۔ اور نوٹس بھی لکھائے تھے۔ کچھ نوٹس اب بھی میرے پاس موجود ہیں۔ ٹریننگ کے بعد ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ کی صدارت کا مسئلہ سامنے آیا تھا۔ مجھے یاد ہے مولانا نظام الدین صاحب اتفاق سے آئے ہوئے تھے انہوں نے مجھ سے کہا: ''چوں کہ آپ مقامی ہیں اس لیے آپ جامعہ کی صدارت کے لیے مناسب ہیں۔'' میں نے ان کو مشورہ دیا کہ مولانا شبیر صاحب اصلاحی صدارت کے لیے موزوں رہیں گے۔

۱۹۶۲ء میں مولانا شبیر صاحب کو صدر مدرس بنایا گیا۔ کچھ دنوں بعد غالباً اگست ۱۹۶۲ء میں میں جامعہ اسلامیہ سے بعض وجوہ کی وجہ سے مستعفی ہو گیا اور کلکتہ چلا گیا۔

صفحہ نمبر ۶۱ پر درج ہے:

> ''مولوی محمد عیسیٰ صاحب کو جب استاد مقرر کیا گیا تو انہوں نے جامعہ کے نصاب میں عربی زبان کی کچھ بنیادی کتابیں داخل کیں، لیکن وہ یہ کام منظم انداز میں نہیں کر سکے۔ جولائی ۱۹۵۹ء کے اسی مہینے میں مولوی رحمت اللہ، شیخ ادریس اور محترم جنید احمد صاحب کا بھی تقرر عمل میں آیا۔ مولوی محمد عیسیٰ ومولوی رحمت اللہ صاحب عربی ودینیات پڑھاتے تھے، جب کہ ماسٹر جنید صاحب انگریزی وہندی کے استاد تھے۔''

مولوی رحمت اللہ صاحب مرحوم اور شیخ محمد ادریس صاحب مرحوم کا تقرر جولائی ۱۹۵۹ء میں مدرسہ اسلامیہ کے لیے ہوا تھا۔ ماسٹر جنید صاحب کا تقرر ۱۹۶۰ء میں جامعہ اسلامیہ میں ہندی وغیرہ پڑھانے کے لیے ہوا تھا۔

جس نہج پر جامعہ کو چلانا تھا اس کے مطابق جماعت اسلامی کا نصاب تعلیم مرتب تھا۔ عربی کی کچھ کتابیں داخل کرنی تھیں، سو وہ نصاب میں شامل تھیں۔ فی الوقت نصاب مرتب کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

ماسٹر جنید صاحب مرحوم کے تقرر کا حال بھی سن لیجیے:

> ادارہ کے آغاز سے ہی درجہ ششم کے لیے میں تنہا مدرس تھا۔ ہندی وغیرہ کے لیے استاد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں ماسٹر جنید صاحب کے گھر گیا۔ 'دیدی' (والدہ ماسٹر جنید صاحب مرحوم) نے بچوں کو آواز دی کہ کچھ لاؤ مولوی صاحب چندہ کے لیے آئے ہیں۔ میں نے کہا: ماں، میں چندہ ہی کے لیے آیا ہوں لیکن آپ کے بچے کو چندہ میں چاہتا ہوں، دیدی نے ماسٹر جنید صاحب مرحوم کو آواز دی اور کہا کہ دیکھو مولوی صاحب کیا کہتے ہیں۔ ماسٹر

صاحب آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو مدرسہ میں تعلیم دینے کے لیے چلنا ہے۔ وہ فوراً آمادہ ہوگئے۔ اس طرح ان کا مدرسہ میں تقرر ہوا۔ والدہ ماسٹر جنید مرحوم کو اکثر لوگ 'دیدی' کہتے تھے۔

انجمن تعلیمات دین

قاضی عدیل عباسی مرحوم، جماعت اسلامی ہند اور علی میاں ندوی وغیرہ نے جب سرکاری منظور شدہ جبری تعلیم کی مضرت سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے آزاد اسلامی مکاتب اور مدارس کے قیام اور تنظیم کے لیے تحریک چلائی اور انجمن تعلیمات دین کے نام سے ایک انجمن بنائی تو صوبہ کے مختلف جگہوں پر اس کے مراکز اور سینٹر قائم کیے۔ ایک مرکز اعظم گڑھ شبلی منزل میں بھی قائم ہوا۔ مولانا مجیب اللہ ندوی دارالمصنفین میں رہتے تھے۔ غالبًا ان کو ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ ان کی اور ان کے رفقا کی کوششوں سے جامعہ اسلامیہ بلریا گنج میں بھی انجمن تعلیمات دین کی عارضی تشکیل ہوئی۔ جس کی رپورٹ بقلم ماسٹر عبدالجلیل صاحب مرحوم یہ ہے۔

کارروائی جلسہ انجمن تعلیمات دین بلریا گنج اعظم گڑھ

''بحمد للہ آج بتاریخ ۶؍نومبر ۱۹۶۰ء بروز اتوار بوقت دو بجے دن جامعہ اسلامیہ بلریا گنج میں انجمن تعلیمات دین کی تشکیل کی میٹنگ شروع ہوئی۔ میٹنگ کے پروگرام کے دو اجزا تھے۔ پہلے پروگرام میں جامعہ اسلامیہ بلریا گنج کے طلبا کے سامنے ان بچوں کو انعامات تقسیم کرنا تھا جنہوں نے انٹر اسلامیہ مکاتب ٹورنامنٹ اعظم گڑھ میں شرکت کیا تھا۔ اور انعامات حاصل کیے تھے۔ دوسرے پروگرام میں انجمن تعلیمات دین کی ایک شاخ کی بلریا گنج میں تشکیل تھی۔

جلسہ کی کارروائی جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی ایڈیٹر معارف کے زیر اثر ہونا طے پایا تھا لیکن موصوف کا موٹر راستہ میں خراب ہوگیا۔ لہٰذا جلسہ کے پہلے پروگرام کا آغاز ٹھیک دو بجے جناب حکیم مولانا صلاح الدین صاحب جیراج پوری کے زیر صدارت ہوا۔ جامعہ اسلامیہ کے چند طلبہ نے نعتیہ، نظمیں، غزلیں اور تقریریں پیش کیں۔ سامعین نے شاباشی اور تعریفوں کے پل باندھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ بعدہ جناب صدر نے ان بچوں کو انعامات تقسیم کیا جنہوں نے انٹر اسلامیہ مکاتب ٹورنامنٹ اعظم گڑھ میں شرکت کر کے انعامات حاصل کیے تھے۔

میٹنگ کا پہلا جز ختم ہوتے ہی اعظم گڑھ سے شاہ معین الدین صاحب (ایڈیٹر معارف)، جناب مولانا

مجیب اللہ ندوی صاحب (دارالمصنفین)، جناب ماسٹر ابرار احمد صاحب (شبلی اسکول)، جناب سید شوکت حسین صاحب وکیل اور جناب شاہ عبدالخالق صاحب تشریف لائے۔

میٹنگ کے دوسرے جز کی کارروائی جناب شاہ معین الدین صاحب (ایڈیٹر معارف) کی زیر صدارت شروع ہوئی۔

پہلے جناب مجیب اللہ ندوی (دارالمصنفین) نے دینی تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے بستی کانفرنس اور بورڈ کی تشکیل پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد جناب ماسٹر ابرار صاحب نے دینی تعلیم کی ضرورت پر ایک مختصر اور جامع تقریر کی۔ تقریر کے بعد سامعین کی طرف سے ایک سوال اٹھایا گیا کہ اگر بورڈ (گورنمنٹ) سے منظور نہ کرایا گیا تو اس کے کیا نتائج ہوں گے؟ موصوف نے اپنے مدلل جواب سے سامعین کو مطمئن کیا۔

تقریروں کے خاتمہ کے بعد مختلف اسلامیہ مکاتب اور مواضعات سے آئے ہوئے نمائندوں کو (جلسہ میں شرکت کرنے والے نمائندوں کے دستخط پچھلے صفحات پر سبط (ثبت) ہیں) اشتہارات اور فارم الحاق دیے گئے۔ بعدازاں بلریاگنج میں انجمن تعلیمات دین کی عارضی تشکیل ہوئی۔ اور خاک سار کو عارضی ذمہ داری سونپتے ہوئے کہا گیا کہ جب الحاق کے فارم کی خانہ پوری کرکے لوگ واپس کردیں گے تو نمائندوں کی میٹنگ بلاکر عہدیداران انجمن کا انتخاب ہوجائے گا۔

بعدہ حاضرین نے چائے سے فراغت حاصل کرکے نماز عصر ادا کی اور جلسہ کا اختتام دعاؤں کے بعد ہوا۔

خلیل احمد بلریاگنج

۷نومبر ۱۹۶۰ء

اس کے بعد ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی طرف سے ماسٹر عبدالجلیل صاحب مرحوم نے یہ لکھا:

''بعض مجبوریوں کی بنا پر میں میٹنگ نہ بلا سکا لہٰذا اب یہ کام مولوی عیسیٰ صاحب عربی استاذ جامعہ اسلامیہ بلریاگنج کو سونپ دیا ہے۔ وہ اس کام کو ان شاءاللہ بحسن وخوبی انجام دیں گے۔''

خلیل احمد

۱۰/دسمبر ۱۹۶۰ء

اس کے بعد میں نے ۱۱/جنوری ۱۹۶۱ء کو میٹنگ بلاکر انجمن تعلیمات دین کے عہدیداران کا انتخاب کرایا۔ جس میں متفقہ طور پر جناب حکیم عبدالوحید صاحب (ہنگائی پور) کو صدر انجمن اور جناب شمس الحق

صاحب (ہنگائی پور) کوسکریٹری اور جناب محمد شعیب صاحب (علاء الدین پٹی) کو خازن، جناب محمد اکرام صاحب ناظم جامعہ اسلامیہ بلریا گنج کو نائب صدر مقرر کیا اور ہر گاؤں سے ناظم مدرسہ کو ممبر۔

میں نے اپنے بعض ساتھیوں ماسٹر جنید صاحب مرحوم اور مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم کے ساتھ انجمن تعلیمات دین کے مقصد کے تحت مدارس اسلامیہ کی تنظیم وقیام کے سلسلے میں شیتل پور، جمئل پور، زید پور، سرائے قاضی، مصرپور، مہراج گنج، علاء الدین پٹی، جگمل پور، ٹکریا، گلواں گوری، نصیر پور وغیرہ مواضعات کا دورہ کیا۔ اور قیام وتنظیم مکاتب اسلامیہ کی کوشش کی۔ جس کی رپورٹ میرے پاس محفوظ ہے۔ آپ نے صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے:

> ''۲۹ رجون ۱۹۶۴ء کو جامعۃ الفلاح کی مجلس انتظامیہ کے ذریعہ منظور آئین کے مطابق جامعہ کے درج ذیل اغراض ومقاصد طے کیے گئے''۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ جس مجلس انتظامیہ کے ذریعہ آئین منظور ہوا اسے کس نے منتخب کیا تھا؟ اور اس انتظامیہ میں کون لوگ تھے؟ کیا دستور سازی کے لیے کوئی عوامی میٹنگ کی گئی تھی یا کچھ خاص لوگوں نے بنالیا؟ کیا ویسا ہی ہوا جس طرح ۱۹۵۶ء میں شورائی طور پر بقول آپ کے ادارے کا ایک مختصر دستور منشی محمد فوجدار صاحب کے ہاتھ کا مرتب کردہ منظور ہوا۔'' (ص ۵۷)

آپ کی مرتب کردہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ جامعہ کا قیام ۵۹-۱۹۶۰ء میں ہوا نہ کہ ۱۹۶۲ء میں۔ اس کا محرک ومجوز ایک غریب 'مولوی' ہے۔ جو ابھی بقید حیات ہے مرحوم نہیں۔ جیسا کہ آپ نے صفحہ ۷۹ حاشیہ نمبر ۶ میں درج کیا ہے۔

آپ نے صفحہ ۷۹ پر مخطوطہ محمد عارف خان۔ بعنوان اسلامی مدرسہ سے جامعۃ الفلاح تک، مورخہ ۲۔ نومبر ۱۹۸۲ء، ورق ۵، کا حوالہ دیا ہے۔ عزیز محترم ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی نے بھی اپنی کتاب میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مضمون شائع کیوں نہیں کرایا جاتا۔ جب کہ عارف صاحب نے شائع کرنے ہی کے لیے دیا تھا۔

جماعت اسلامی سے تعلق

''جماعت اسلامی ہند سے جامعۃ الفلاح کا رشتہ وتعلق ابتدا ہی سے رہا ہے۔ قصبہ بلریا گنج سے جماعت اسلامی کے سب سے پہلے رکن حکیم محمد ایوب صاحب ہیں۔ ۱۹۵۶ء سے جامعہ کا جو دوسرا دور شروع ہوا اس کے

روحِ رواں اور میر کارواں حکیم صاحب ہی تھے۔حکیم جی اور ان کے شریک کار ڈاکٹر خلیل احمد صاحب،مولوی محمد عیسیٰ صاحب و دیگر حضرات سکریٹری جماعت ملک حبیب اللہ قاسمی صاحب و ناظم ضلع مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر جامعۃ الفلاح کے امور ومسائل پر تبادلۂ خیال کرتے اور پھر فیصلے کرتے۔''(ص ۷۷)

عرض ہے کہ ۱۹۵۶ء میں میرا جماعت اسلامی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔بجز اس کے کہ جماعت کا لٹریچر زیر مطالعہ رہتا تھا۔یہی حال ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا بھی تھا۔ہوسکتا ہے وہ بھی جماعت کا لٹریچر پڑھتے رہے ہوں۔لیکن ان کا بھی جماعت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔اس وقت صرف حکیم ایوب صاحب ہی رکن جماعت تھے۔اس کے بعد منشی محمد انور صاحب رکن جماعت ہوئے۔اور غالباً ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء میں میری اور حاجی امانت اللہ صاحب مرحوم کی رکنیت منظور ہوئی۔مولانا عبدالحسیب صاحب (علاء الدین پٹی) مقامی امیر تھے۔۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۹ء تک محترم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا جامعہ کے قیام وتحریک میں کوئی رول نہیں رہا۔ان کی دل چسپی ۱۹۶۰ء کے آخر اور ۱۹۶۱ء سے شروع ہوئی۔ہاں۔حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم اور مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے تعلیمی نظریہ سے متاثر بعض افراد کی ہمدردیاں شامل رہی ہیں۔۱۹۶۲ء تک ملک حبیب اللہ صاحب،مولانا ابوبکر اصلاحی،مولانا نظام الدین صاحب،مولانا مجیب اللہ صاحب،وغیرہ اور جماعت کے افراد کی دل چسپی اعظم گڑھ میں ایک ادارہ قائم کرنے پر رہی ہے۔اور ۱۹۶۲ء میں وہ ادارہ جامعۃ الرشاد کے نام سے قائم ہوگیا۔میں نے بھی سنا تھا جیسا کہ آپ نے لکھا ہے:

> ''کچھ ہی دنوں بعد مولانا مجیب اللہ صاحب وملک حبیب اللہ قاسمی صاحب کے درمیان نزاع پیدا ہوگیا۔اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک حبیب اللہ صاحب اور ان کے ہم نوا جامعۃ الرشاد سے مایوس ہوگئے اور جامعۃ الفلاح کا رخ کیا۔''(ص ۷۷)

غالباً جامعۃ الرشاد کی سرپرستی کے معاملہ میں ہوا تھا۔مولانا حبیب اللہ صاحب کا کہنا تھا کہ سرپرست جماعت اسلامی ہند ہوگی۔اور مجیب اللہ صاحب کا خیال تھا کہ مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری سرپرست ہوں گے۔

> ''مدرسہ اسلامیہ کا نام جامعہ اسلامیہ میں نے رکھا تھا۔میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ نہیں ہوں۔ہاں مدرسہ دیوبند میں پڑھا ہے۔فراغت جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور سے حاصل کی ہے۔''

دیوبند کے اساتذہ میں یہ چند محترم حضرات ہیں:

استدراک

''مولانا محمد نصیر احمد خاں صاحبؒ شیخ الحدیث جن کا ابھی کچھ دنوں پہلے انتقال ہوا ہے۔ مولانا سالم قاسمی مدظلہ، مولانا محمد حسین صاحب بہاریؒ، مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ محدث دیوبندی کے صاحب زادے مولانا اختر میاں مرحوم۔''

مبارک پور کے اساتذہ میں سے چند یہ ہیں:

محدث مولانا علی احمد صاحب کوئریا پاریؒ، مولانا مفتی یسین صاحبؒ، مولانا بشیر احمد صاحبؒ، مولانا محمد عثمان ساحرؒ مبارک پوری، مولانا داؤد اکبر صاحب بھوریؒ، مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ، مولانا قاری ظہیر الدین صاحبؒ پورہ معروفی، مولانا عبدالباری صاحب قاسمیؒ، مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ وغیرہ۔

ختم بخاری شریف محدث جلیل ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ نے کرائی، جنہیں مئو کے لوگ نام لینے کے بجائے بڑے مولانا کہتے تھے۔

میرے اساتذہ میں ایک دو کے سوا سارے ہی قاسمی ہیں۔ میں بھی مسلکاً اور ذوقاً قاسمی ہی ہوں۔ اگر بعض تحریروں میں مجھے قاسمی لکھا گیا ہے تو بہت زیادہ بے جا نہیں ہے۔ جیسے مولانا جلیل احسنؒ ندوی ندوہ سے فارغ نہیں ہیں لیکن ندوی کہے جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ بھی ندوہ سے فارغ نہیں ہیں لیکن ندوی کہے جاتے ہیں۔

یہ معروضات حاضر ہیں۔ اگر کوئی بات وضاحت طلب ہو تو وضاحت طلب کر سکتے ہیں۔ اور بھی کوئی بات محل نظر ہوئی تو فرصت اور توفیق ملی تو اظہار خیال کروں گا۔ (ان شاءاللہ)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ متوسلین و منتظمین جامعہ کو توفیق ارزانی کرے کہ وہ ایسا نصاب تعلیم وضع کرنے کی سعی کریں جس میں علوم قدیمہ وجدیدہ کا بہترین امتزاج ہو نہ کہ پیوند کاری۔ کام دشوار ہے لیکن ناممکن نہیں۔

●⧉●

دین کا قرآنی تصور: ایک مطالعہ

محمد انس مدنی

بانیِ تحریک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بعد تحریک اسلامی میں جن مصنفین کی کتابوں نے ارکان وکارکنان میں تحریکی فکر وشعور، مشن اور نصب العین سے آگہی اور حرکیت پیدا کی اور تحریکی لٹریچر کو مدلل اور مستند بنایا ہے، ان میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے ساتھ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کا نام آتا ہے۔ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کی کتابوں نے فکری اور علمی غذا فراہم کی ہے۔ مولانا صدرالدین اصلاحی کی یہ کتابیں: اساسِ دین کی تعمیر، دین کا قرآنی تصور، معرکہ اسلام وجاہلیت، فریضہ اقامت دین، اسلام اور اجتماعیت تحریکی لٹریچر میں قیمتی اثاثہ ہیں۔

دین کا قرآنی تصور مولانا صدرالدین اصلاحی کی شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۶۷ء کو منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب دین کے قرآنی تصور کی تحقیق، تنقیح اور تعیین پر مبنی ہے۔ کتاب پانچ مباحث: دین ومذہب کا بنیادی تصور، قرآن اور محبت الٰہی، قرآنی تصور دین کے بنیادی تقاضے، عشق الٰہی پر مبنی تصور دین اور پیروانِ قرآن پر تصورِ عشق کا اثر پر مشتمل ہے۔

دین کا قرآنی تصور کیا ہے اور مروجہ تصورِ دین کی خامیاں کیا ہیں؟ دین کے بنیادی تصور کو جاننے کے ذرائع اور مراجع تحقیق کیا ہیں؟ نیز دین کے بنیادی تصور سے واقفیت کے ثمرات اور ناواقفیت کے کیا نتائج ہیں؟ یہ کتاب ان ہی سوالوں کے جواب کا احاطہ کرتی ہے۔ دین کے بنیادی اور حقیقی تصور کو جانے بغیر اخلاص وللّٰہیت کے باوجود دین کی حقیقی پیروی نہیں کی جاسکتی۔ انسان اخلاص وللّٰہیت کے باوجود دین کی اصل شاہ راہ سے بھٹک جاتا ہے۔

مبحث اول 'دین ومذہب کا بنیادی تصور' میں دین کے بنیادی تصور سے کیا مراد ہے؟ مصنف رقم طراز ہیں: 'دین کے بنیادی تصور' سے مراد اس کا وہ مرکزی نقطۂ نگاہ ہے جس کے مطابق وہ اپنے پیروؤں کی پوری

فکری اور عملی، ظاہری اور باطنی زندگی کو ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتا ہو‘۔ (ص ۱۱)

کسی دین کا بنیادی اور حقیقی تصور اس کے تصورِ خدا یعنی خدا کے بارے میں اس کا نظریہ کیا ہے، اس سے کسی دین کے حقیقی اور بنیادی تصور کے بارے میں پتا چل سکتا ہے۔

توحیدی ادیان میں خدا کے بارے میں دو بڑے تصورات پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تمام ہی جلالی و جمالی صفات حسنہ سے کمال کی حد تک متصف ہے۔ وہ سارے جہانوں کا کارساز، مدبر، منتظم، قادر مطلق اور مقتدر اعلیٰ ہے۔ دوسرا تصور یہ کہ خدا اگر چہ ہر طرح کی صفات کمال سے متصف ہے، مگر جہاں تک انسان کا تعلق، اس کی جمالی صفتیں، خصوصاً اس کا حسن مطلق ہونا ہی اس کے لیے سب سے اہم، فیصلہ کن اور مرکز نگاہ قرار پانے والی صفت ہے۔ اس تصور کی رو سے خدا اور انسان کے مابین اصل تعلق معشوق حقیقی اور عاشق صادق کا تعلق ہے۔ پہلے تصور کی رو سے دین وخدا پرستی کا بنیادی تصور واضح طور پر ’’خدا کی مکمل غیر مشروط اور والہانہ اطاعت‘‘ اور دوسرے کی تصور سے ’’خدا کا مکمل اور سچا عاشق‘‘ قرار پاتا ہے۔ ’تصور دین کی تحقیق کا صحیح طریقہ‘ کے ذیلی عنوان کے تحت پانچ مراجع تحقیق بیان کیے ہیں، جو دین کا بنیادی تصور معلوم کرنے کے لیے ضروری ہیں:

۱۔ اس دین نے اللہ تعالیٰ کو کن کن صفات سے متصف قرار دیا ہے؟

۲۔ انسان کا مقصد وجود کیا ہے؟

۳۔ نوع انسانی کی مخصوص تخلیقی حیثیت کیا قرار دی ہے؟

۴۔ بشریت کے لوازم کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

۵۔ اپنے پیروؤں کو جو ہدایات دے رکھی ہیں اور جن احکام وقوانین کے اتباع کی انہیں تلقین کی ہے وہ کس نوعیت کے ہیں؟

صفات الٰہی کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر اچھی صفات سے کمال درجے میں متصف ہے۔ یہ صفات واضح کر دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ محبوب ترین آقا وفرماں روائے مطلق ہے، یہی اس ذات بابرکت کا حقیقی تصور ہے، اور یہی اس کی اصل حیثیت ہے۔ اللہ اور انسان کے درمیان اصل تعلق انتہائی محبوب آقا اور انتہائی باوفا غلام کی، حقیقی فرماں روائے کے مطلق اور طاعت شعار رعیت ہی کی نوعیت ہو سکتی ہے۔ (ص ۷۶)

دوسرے مرجع تحقیق انسان کا مقصد وجود میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ قرآن حکیم نے نوع انسانی

کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت بتایا ہے۔ عبادت کا مفہوم و مدعا یہ ہے کہ انسان اللہ کے حضور ظاہر و باطن ہر حیثیت سے جھک جائے اور دل کے پورے اخلاص اور خضوع کے ساتھ اس کی بندگی اور اس کے احکام کی پابندی کرے۔ ان دونوں حقیقتوں کی روشنی میں واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کا بنیادی تصور دین اللہ رب العالمین کی مکمل اور والہانہ اطاعت ہی ہوسکتا ہے، عشق الٰہی نہیں ہوسکتا۔ (ص ۷۷)

چوتھا مرجع تحقیق لوازم بشریت کے بارے میں مصنف نے اس بحث میں اس نقطے پر گفتگو کی ہے کہ انسان کی فطری خواہشات و جذبات اور پیدائشی قوتوں کے بارے میں دین اسلام کا کیا موقف ہے اور قرآن کیا کہتا ہے؟ آیات و احادیث کی تفصیلی شہادتیں بیان کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

> ''بشریت کے جمیع لوازم، یعنی انسان کے اندر پائی جانے والی سبھی پیدائشی قوتیں، جبلّی خواہشیں اور فطری جذبات اس کی انسانی شخصیت کے لازمی اجزا ہیں، اور اس کی صالح تعمیر و ارتقا کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔۔۔ معیاری انسانیت، یعنی صحیح اور مکمل خدا پرستی موقوف ہے اس بات پر کہ ان میں سے ایک ایک کا 'حق' ادا کیا جائے، اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے اور انہیں مناسب انداز اور حدود میں بہر حال پورا کیا جائے''۔ (ص ۶۲)

احکام قرآنی کی وسعت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''قرآن کریم نے اپنی مطلوبہ دین داری اور خدا پرستی کا فریضہ ادا کرنے کے لیے انسان کو جو احکام و ہدایات دی ہیں، وہ اس کی پوری زندگی کے سبھی مسائل کو اپنے دائرے میں لیے ہوئے ہیں، اس کی روح کے تقاضوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں، اور جسم و جان کے مطالبات سے بھی بحث کرتے ہیں''۔ (ص ۸۱)

اس پوری بحث کے بعد مصنف رقم طراز ہیں: '' قرآن کریم کا بنیادی تصور دین اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت ہے، کچھ اور نہیں ہے، یہاں اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کا مفہوم بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ یہ کچھ معروف قسم کی رسمی اور ظاہری اطاعت نہیں ہے، بلکہ اپنی نوعیت کی ایک ہی اطاعت ہے۔ یہ ایسی اطاعت ہے جو ظاہری خود سپردگی و سرفگندگی تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ اس کے اندر قلب کی پوری آمادگی اور عبدیت کا پورا خضوع اور تذلل بھی موجود رہتا ہے''۔ (ص ۸۳)

مبحث ثانی 'قرآن اور محبت الٰہی' میں مصنف نے اس بات پر بحث کی ہے کہ قرآن مبین کا بنیادی تصور دین اللہ جل شانہ کی مکمل اور والہانہ اطاعت ہے، عشق الٰہی نہیں ہے۔ محبت کی قسمیں بیان کرتے ہوئے کہتے

ہیں کہ ایک محبت وہ ہوتی ہے، جس کی بنیاد عقل اور اعتقاد پر ہوتی ہے اور جو اپنے طور خواہ کتنی ہی ترقی کر لے ہر حال میں محبت ہی رہتی ہے۔ دوسری محبت وہ ہوتی ہے جس کا سرچشمہ نفس اور طبعی جذبات ہوتے ہیں۔ یہی محبت ہے جو حد سے آگے بڑھ جاتی ہے تو 'عشق' بن جاتی ہے اور عشق کہلاتی ہے۔(ص۹۰)

مصنف نے یہاں اس بات کی بھی وضاحت کی ہے اللہ سے عشق کے بجائے محبت کا لفظ کیوں استعمال ہوا ہے۔ چونکہ ہم اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ادراک حسی یا طبعی طور پر نہیں رکھتے، بلکہ سرتا سر عقلی اور وجدانی طور پر رکھتے ہیں۔اس لیے اس سے کی جانی والی محبت بھی اصلاً طبعی قسم کی نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے، بلکہ عقلی نوعیت کی ہوتی ہے۔

محبت الٰہی کی نوعیت، اہمیت اور کیفیت بیان کرنے کے بعد اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ محبت الٰہی کو قرآن کا تصورِ دین کیوں نہیں کہا گیا ہے؟ رقم طراز ہیں:

> ''دین میں محبت الٰہی کی گرچہ بڑی اہمیت تھی، اور اس اہمیت کا تقاضا یہی تھا کہ اہل ایمان کو اس کا صراحتاً حکم دیا جاتا اور بار بار دیا جاتا، لیکن مذاہب کی پچھلی پوری تاریخ کو دیکھتے ہوئے اس بات کا کھلا ہوا اندیشہ تھا کہ اگر 'اعبدو الله' اور 'اطیعوا الله' کی طرح 'احبوا اللہ' بھی فرمایا گیا تو قرآن کے پیرووں کے لیے بھی کہیں اسی طرح کی غلط فکری اور غلط روی کی شہ نہ مل جائے جس میں پچھلی قومیں اور ملتیں مبتلا ہوتی رہی ہیں۔یعنی پہلے قدم پر تو محبت الٰہی کو، اور آگے چل کر عشق الٰہی کو دین کا بنیادی تصور نہ سمجھ بیٹھیں''۔(ص۱۰۵)

باب ثالث 'قرآنی تصور دین کے بنیادی تقاضے' چند اہم تقاضے بیان کیے گئے ہیں:

۱۔اللہ کی انتہائی تعظیم اور انتہائی محبت

۲۔مقصود مومن صرف رضائے الٰہی

۳۔ترک دنیا سے کامل اجتناب

۴۔دین اللہ کی وحدت

۵۔وحی اور شریعت کی ناگزیر احتیاج

۶۔احکام الٰہی کا غیر مشروط اتباع

۷۔نبی وقت کی پیروی کا وجوب

۸۔احکام دین کی تفریق کی حرمت

مبحث رابع 'عشق الٰہی پر مبنی تصور دین' اس باب میں عشق الٰہی پر مبنی دین کا تعارف، سرچشمہ اور مزاج پر

گفتگو کی ہے۔عشق اوراس کے مزاج کی خصوصیات بیان کی ہیں، حاصل بحث یہ ہے کہ:

۱۔عشق کی بارگاہ میں عقل ودانش کی رسائی نہیں ہوسکتی۔

۲۔عشق انسان کواجتماعیت سے دور بھاگنے والا اور سخت قسم کا انفرادیت پسند بنا دیتا ہے۔

۳۔عشق کے تسلط کے بعد انسان کے اندر سے توازن اوراعتدال پسندی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

۴۔عشق میں مبتلا شخص آداب اورضوابط کا پابند نہیں رہ سکتا۔(ص ۱۴۶۔۱۴۷)

اس کے بعد مصنف کا یہ جملہ عشق الٰہی پرمبنی تصور دین کی قلعی کھول دیتا ہے۔رقم طراز ہیں: ’’یہ عشق کا مزاج۔اس مزاج کے آئینے میں اس تصورِ دین کے مزاج کا پورا پورا عکس آسانی سے دیکھ لیا جاسکتا ہے۔جس کی بنیاد عشق الٰہی پر رکھی گئی ہو۔اس کا مزاج بھی یقیناً اسی بے قراری اور شوریدہ سری کا، بے خودی اور ماسوا فراموشی کا، فکر وتعقل سے بے گانگی کا، اورضوابط وقوانین سے وحشت زدگی کا ہوگا۔‘‘(ص ۱۴۷)

عشق الٰہی کے فکری اورعملی تقاضے یا نتائج کا احاطہ کرتے ہوئے پانچ اہم چیزوں کا تذکرہ کیا ہے:

۱۔عبادت کا مقصود وصال خداوندی

۲۔ترک دنیا

۳۔وحی ورسالت سے بے نیازی

۴۔دین کی محدودیت

۵۔وحدتِ ادیان

ان چیزوں کا تذکرہ کرتے ہوئے صوفیا کے ملفوظات اورکتابوں سے متعدد حوالے دیے ہیں۔

مبحث خامس ’پیروان قرآن پر تصورِ عشق الٰہی کا اثر‘ اس باب میں ہمارے یہاں پائے جانے والے دینی افکار واعمال کا جائزہ لیا ہے اور غیر قرآنی افکار کی نشان دہی کی ہے۔اوراس نقطہ پر بحث کی ہے کہ کس طرح عشق الٰہی کے تصور نے ہمارے دینی ذخیرے اورعلما کی فکر کو متاثر کیا ہے۔اس تصور کے نتیجہ میں دین کے قرآنی تصور کے متوازی عشق الٰہی پرمبنی دین قائم اور جاری وساری ہے۔اس فکر سے متاثر لوگوں میں عبادت کا مقصود اللہ کی رضا، آخرت کی فلاح اور جنت کا حصول نہیں ہے ان کی عبادت کا مطمح نظر وصال باری تعالیٰ بن جاتا ہے۔اس تصور کے زیراثر ہمارے یہاں ترکِ دنیا، تنہائی، گوشہ گیری، تجرد، ترک لذات اورفاقہ کشی کو دین کا حسن اوراعلیٰ درجہ قرار دیا گیا یا سمجھا جانے لگا۔اس ضمن میں فاضل مصنف صوفیہ اوراس طبقہ کے علما کے متعدد

اقتباس نقل کیے ہیں۔

قرآن کریم نے وحی اور رسالت کے مکمل احترام اور غیر مشروط اتباع کا حکم دیا ہے۔ان کا مفہوم سمجھنے اور ان کا معیار مطلوب متعین کرنے کے لیے اکثر صوفیہ نے اصل انحصار خود اپنے ہی ذوق اور حال باطن پر کیا ہے۔اور دین کے اجتماعی احکام سے بے التفاتی پیدا ہوئی۔اور دین پر عمل کا دائرہ سمٹ گیا۔وحدت ادیان کا رجحان پروان چڑھا چنانچہ متعدد صوفیہ کے کلام میں وحدتِ ادیان کی فکر کے نمونے ملتے ہیں۔اس باب میں مصنف نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ 'کتاب مبین' کے پیرو اس غیر قرآنی تصور دین سے کس طرح متاثر ہو گئے؟ اس کے تاریخی، سیاسی اور متعدد نفسیاتی اسباب بیان کیے ہیں۔

تاریخی اسباب

ا۔خلافت راشدہ کا مبارک دور کا ختم ہونا۔اجتماعی زندگی سے جس طرح اسلام کے سیاسی اصول واحکام بے دخل ہو گئے اسی طرح سچی دین داری اور حق پسندی وحق گوئی نے بھی اپنے کو گوشوں کی طرف رخ کر لینے پر مجبور پایا۔(ص ۲۲۸)

۲۔صحابہؓ کے دور کے ختم ہو جانے کے بعد نام نہاد عقلیت جسے حکمت اور فلسفہ کے نام پر قبول کیا گیا۔اور ظاہر پسندی اور خشک قانونیت تھی جو فقہی جزئیات مین شرعی احکام کی ظاہری شکلوں کی اہمیت میں غلو اور تشدد پسندی کے باعث ہر طرف پھیل گئی تھی۔(ص ۲۳۰)

نفسیاتی اسباب

ا۔اللہ کی توحید کا مرکزی عقیدہ، جو دین وخدا پرستی کے معاملے میں اصل واساس کی حیثیت رکھتا ہے، قرآنی تصور دین اور عشق الٰہی پر مبنی تصور دین، دونوں ہی کا متفقہ عقیدہ ہے۔یعنی بنیادی 'حق' دونوں میں مشترک ہے۔مرکزی عقیدے اور بنیادی حق کی یہ وحدت ایسی چیز تھی جو عام لوگوں میں اس غلط فہمی کا سبب بنی۔

۲۔اللہ تعالیٰ کی 'محبت' اگر چہ قرآن کے نزدیک بھی غیر معمولی حد تک مطلوب وناگزیر ہے، لیکن اس کی مطلوبہ محبت الٰہی اور چیز ہے، اور اللہ کی عشقی محبت دوسری شے ہے۔دونوں کے درمیان جو فرق ہے، وہ بہت بڑا بھی ہے اور ساتھ ہی انتہائی نازک بھی ہے۔اپنی اسی نزاکت کے باعث وہ اچھی طرح ملحوظ نہ رکھا جا سکا۔اور بالآخر دونوں ہی قسم کی محبتوں کو ایک ہی سمجھ لیا گیا۔(ص ۲۳۲)

۳۔عبادت کے صحیح قرآنی مفہوم سے عام لوگوں کی ناواقفیت ہے۔عشقی تصور دین کے تحت تو جو کچھ بھی

انجام دیا جاتا ہے، وہ سب کا سب صرف عبادت ہوتا ہی نہیں ہے بلکہ عبادت ہی سمجھا جاتا ہے۔ (ص ۲۴۱)

کتاب کے اختتام پر مصنف نے راہ حق کی دو عظیم رکاوٹوں کا تذکرہ کیا ہے، جو دین کے سچے داعی اور مزاج شناس شخص کو دین کے اصل تصور کی دعوت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔

پہلی رکاوٹ تو دینی شخصیتوں کی عقیدت کے غلو کی ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ ذہنی اصلاح و تعمیر کی اس مہم کے سلسلے میں ملت کی بہت سی عظیم المرتبت اور قابل احترام ہستیوں کے افکار و اعمال بھی زیر بحث آئیں گے۔

دوسری بڑی رکاوٹ وقت کی سیاسی مصلحت کی ہے۔ موجودہ دور کی سیاست دین کے اس انقلابی تصور کو برداشت کرنے کے لیے ایک لمحے کے لیے بھی تیار نہیں ہو سکتی ہے جس کی قرآن عزیز نے تعلیم دی ہے۔ اس لیے اس دین اور تصور دین کو لے کر اٹھنا دراصل انتہائی شدید ملامتوں اور طوفانی مخالفتوں کو دعوت دینا ہے۔ (ص ۲۵۹)

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کی یہ کتاب مروجہ تصور دین یعنی صوفیہ کے افکار و اعمال پر کاری ضرب ہے۔ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے اس کتاب میں دین کے قرآنی تصور کی بنیادیں، تقاضے، ثمرات اور غیر قرآنی تصور دین یعنی عشق الٰہی پر مبنی دین کے مزاج، فکری اور عملی تقاضے اور نتائج پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کہتے ہیں کہ صوفیہ کے بگاڑ کی اصل خرابی تصورِ دین کی خرابی اور دین کے حقیقی تصور سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ دین کے قرآنی تصور سے واقفیت اور اس سے شعوری وابستگی اور اللہ کی اطاعت اور اس سے والہانہ لگاؤ پیدا کرنے میں اس کا مطالعہ بہت مفید اور معاون ہوگا۔

رسول اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین

محمد اسعد فلاحی

یہ کتاب دراصل رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کی سیرت پر مستند حوالوں کی روشنی میں ایک خوب صورت مجموعہ ہے، جسے نصابی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف جناب محمد رئیس ہیں، جو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دینیات کے استاد ہیں۔

کتاب پیش لفظ، تقریظ اور مقدمہ کے علاوہ پانچ (۵) ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں رسول اللہ ﷺ کی آمد سے قبل اس وقت کے سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی حالات کا مختصراً ذکر ہے۔ ابتدا میں عرب کی وجہ تسمیہ بتائی گئی ہے۔ پھر عرب کے جغرافیہ کا بیان ہے۔ اس کے بعد تقریباً پچاسی (۸۵) صفحات میں رسول اللہ ﷺ کی آمد سے خطبۂ حجۃ الوداع تک کے اہم موضوعات: حلف الفضول، تعمیر کعبہ، آغاز تبلیغ، ہجرت حبشہ، سماجی بائیکاٹ، ہجرت مدینہ اور غزوۂ بدر و غزوۂ احد وغیرہ کو مختصر، جامع اور سلیس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے آخر میں طلبہ کی یاد دہانی کے لیے سیرت رسول ﷺ کے مشہور واقعات کی فہرست (ہجری اور عیسوی تاریخوں کے ساتھ) درج ہے۔

اگلے چار ابواب، جو نوّے (۹۰) صفحات پر مشتمل ہیں، ان میں بالترتیب خلفائے راشدین کی حیات، خلافت، کارنامے اور خدمات کا تذکرہ اختصار سے کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں مصنف نے خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ کے حالاتِ زندگی، قبولِ اسلام، اخلاق و عادات کا ذکر کرتے ہوئے زمانۂ خلافت کو تین صفحات میں سمیٹ دیا ہے۔ حضرت اسامہؓ کے لشکر کی روانگی، جھوٹے مدعیان نبوت کا قلع قمع، منکرین زکوٰۃ سے جنگ اور جمع و تدوین قرآن مجید کو حضرت ابوبکرؓ کے اہم کارناموں میں شمار کیا گیا ہے۔ خلاصہ کے طور فاضل مصنف نے حضرت ابوبکرؓ کی بعض خوبیوں کا ذکر نکات کی شکل میں کیا ہے۔

تیسرے باب میں خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کا تذکرہ ہے۔ مصنف حضرت عمرؓ کے بارے میں لکھتے ہیں: قرآن کریم کی بہت ساری آیتیں آپؓ کی رائے کے مطابق نازل ہوئیں، بدر کے قیدیوں کے متعلق، منافقین کی نماز جنازہ سے متعلق، ازواج مطہراتؓ کے پردے کے متعلق، مقام ابراہیم کو مصلی بنانے کے متعلق، شراب کے حرام کیے جانے کے متعلق وغیرہ انہی کی تائید قرآن مجید میں کی گئی ہے۔ (ص ۱۴۵)

حضرت عمرؓ کے کارناموں میں فتح ایران، فتح شام، فتحِ بیت المقدس، مصر کی فتوحات اور فتح اسکندریہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے اولیات عمرؓ (یعنی وہ کام جو سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے کیے) کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ کیا ہے، جن میں مملکت میں صوبوں کی تقسیم، فوجی محکمہ کا قیام، عدالتوں کا قیام، بیت المال کا قیام، جیلوں کا قیام، فوجی چھاؤنیوں کا قیام، مکہ اور مدینہ کے درمیان چوکیاں اور سرائے کا قیام وغیرہ شامل ہیں۔ ہجری کلنڈر کی ابتدا بھی حضرت عمرؓ کا اہم کارنامہ ہے۔ (ص ۱۵۸)

آخری دو ابواب حضرات عثمانؓ اور علیؓ کے حالات زندگی اور کارناموں پر ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے تقریباً بارہ (۱۲) سال خلافت کی۔ ان کے دور میں بہت سارے علاقے فتح کیے گئے، جس سے اسلامی سلطنت کا دائرہ اور بڑھ گیا۔ حضرت عثمانؓ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عہد صدیقی میں مدوّن کیے گئے قرآن پاک کے نسخے کی نقلیں کرا کے ممالکِ اسلامیہ میں بھجوائیں اور کلام اللہ کے دوسرے نسخے تلف کرا دیے گئے اور اس طرح مسلمانوں کو ایک قرآن پر متفق کر دیا۔ (ص ۱۷۵)

چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علیؓ بن ابی طالب ہیں۔ آپؓ کا دورِ خلافت مسلمانوں کی آپس کی لڑائیوں کی نذر ہو گیا۔ اگر آپؓ کو سکون واطمینان سے حکومت کرنے کا موقع ملتا تو آپ کا دور عمر فاروقؓ کا نقش ثانی کہلاتا۔ (ص ۱۹۲)

کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے اسے مرتب کرتے وقت طلبہ کا خاص خیال رکھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ہر باب کے آخر میں اہم چیزیں، مثلاً اہم واقعات مع سنہ، مقامات، نقشے وغیرہ درج کیے ہیں۔ اس سے طلبہ کو عہد نبوی وعہدِ خلفائے راشدین کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

کتاب میں جابجا پروف کی غلطیاں ہیں۔ قرآن کی آیت فَاتَّبِعُونی (فَاتَّبِعُونِیْ) درج ہے۔ (ص ٦) پڑھیے [پڑھیے] (ص ٢٦)، اوڑھاؤ [اڑھاؤ] (ص ٢٦)، گیے [گئے] (ص ۴۸)، کرینگے [کریں گے] (ص ۵۰)، بدر کی قیدیوں [بدر کے قیدیوں] (ص ۱۴۵)، گذرتے [گزرتے] (ص ۱۶۹)، آئنہ دار [آئینہ

دار] (ص ۱۶۹)۔ وغیرہ۔ یہ تو محض چند نمونے ہیں۔ پوری کتاب اسی طرح کی غلطیوں سے پُر ہے۔ کتاب میں مرکب الفاظ (مثلاً آنحضرت) کو کہیں ملا کر لکھا گیا ہے، کہیں الگ الگ (آں حضرت)، کہیں صحابہ کے ساتھ 'رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ' مکمل لکھا گیا ہے، کہیں مخفف (ؓ)، کہیں صلی اللہ علیہ وسلم لکھا ہے، کہیں اس کا مخفف (ﷺ)۔ اس طرح کا اندازِ بیاں قاری کے ذوق مطالعہ پر گراں گزرتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس معاملے میں یکسانیت کو ملحوظ رکھا جاتا۔

کتاب مستند حوالوں سے مزین ہے۔ انداز بیان سلیس اور سادہ ہے۔ کتاب کے آخر میں ماخذ ومصادر کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے تاکہ طلبہ مزید مطالعہ کے لیے ان سے رجوع کر سکیں۔ یہ کتاب خصوصی طور پر طلبہ کے لیے اور محبین رسول وصحابہ کے لیے عمومی طور پر مفید ہے۔ امید ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

اس کتاب کی قیمت -/150 روپے ہے اور اس کو 'البلاغ پبلی کیشنز، نئی دہلی نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

●❐●

''ہم یہ چاہتے ہیں کہ دینی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ نہ رہے بلکہ ایک ہی نظامِ تعلیم رائج ہو جس میں دینی تعلیم بھی شامل ہو اور دنیاوی تعلیم بھی۔ یہ 'مسٹر' اور 'مولوی' کی کشمکش جو موجود ہے، اسے ختم کرنا چاہتے ہیں، مسلمانوں کے مجموعی نقصان کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔''

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تصریحات: ۴۳۱)

جامعہ کے لیل ونہار

مولانا مصباح الباری فلاحی

جناب مجتبیٰ فاروق اور ڈاکٹر ملک فیصل فلاحی کی جامعہ آمد

۱۴ر جنوری ۲۰۲۱ء بروز پنج شنبہ ابواللیث ہال میں جناب مجتبیٰ فاروق ڈائریکٹر رابطہ عامہ، جماعت اسلامی ہند اور امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند، یوپی مشرق ڈاکٹر ملک فیصل فلاحی کی جامعہ آمد پر ایک پروگرام منعقد ہوا۔

مصباح الباری فلاحی ندوی کی تلاوت قرآن سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ کنویز مولانا رئیس احمد فلاحی (استاذ شعبۂ اعلیٰ) نے جامعہ کی تعمیر وترقی میں جماعت کے کردار پر روشنی ڈالی۔

مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی نے افتتاحی کلمات میں فرمایا کہ یہ بڑا اہم پروگرام ہے۔ ہم معزز مہمانوں کو مرحبا اور خوش آمدید کہتے ہیں۔ ملک اس وقت جن حالات سے دوچار ہے، ہم سب کو معلوم ہے۔ کووڈ ۱۹، نوٹ بندی، طلاق ثلاثہ کا قانون، بابری مسجد کا فیصلہ، لوجہاد اور اب مدارس اسلامیہ کو بند کرنے کا منصوبہ ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا کی پچھلی قومیں بھی مضبوط تھیں پھر تباہ وبرباد ہوگئیں۔ عروج کے بعد زوال ہوگا اور ترقی کے بعد تنزلی آئے گی۔ جس طرح دوسری قوموں نے سمجھا کہ ہم پر زوال نہیں آئے گا لیکن زوال آیا۔ مسلمانوں نے صدیوں تک حکومت کی لیکن پھر کیا ہوا؟ جب مسلمانوں نے سمجھا کہ ہم ہی غالب رہیں گے تو ان پر بھی زوال آیا۔ ڈیڑھ سو سال اس ملک پر انگریزوں نے حکومت کی ان پر بھی زوال آیا اور اس حکومت کو ابھی صرف چھ سات سال ہوئے ہیں۔ اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ پہلے وہ اٹھاتا ہے پھر پستی میں گراتا ہے۔

بڑی بڑی قومیں تباہ ہوگئیں ایک دن یہ بھی تباہ ہو جائیں گے۔ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دلت اور عیسائی بھی اس حکومت سے پریشان ہیں۔ اسی لیے کسان سراپا احتجاج ہیں۔ اس حکومت نے ہندو مسلمان

کر کے لوگوں کو بز دل بنا دیا ہے۔

اس لیے ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ حلم، صبر اور بردباری سے کام لیں اور پورے ملک کے لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔

ڈاکٹر ملک فیصل فلاحی نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ انتہا پسند قوتوں کا نظریہ ہمارے سامنے بالکل واضح ہے۔ اس ملک کے اقتدار کے تمام مراکز پر آج انتہا پسند قوت قابض ہیں۔ اور یہ قبضہ گزشتہ پچاس سال کی شب وروز کی محنت کا ثمرہ ونتیجہ ہے۔ اوران کی قربانیوں کی بہت طویل فہرست ہے۔ مودی کی دوسری اننگ جب سے شروع ہوئی ہے اس وقت سے اس کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں۔ اور نئے نئے قوانین بنتے جارہے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ، بابری مسجد اور طلاق ثلاثہ کا مسئلہ پھر این آر سی اور سی اے اے کا مسئلہ سامنے آیا۔ مسلم طلبہ وطالبات نے ملک گیر احتجاج شروع کیا اور پھر ایک تحریک شروع ہوگئی اور آج کسان اسی تحریک کے نتیجے میں سڑکوں پر سراپا احتجاج ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر مسلمان آج بھی متحد ہو جائیں تو بڑا کام کر سکتے ہیں۔ جب علم سے ہمارا رشتہ کمزور ہوا تو ہم مغرب کی طرف دوڑ پڑے۔ جس ادارہ سے ہمارا تعلق ہے اس ادارہ کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور اس کا راز دعوت میں پنہاں ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کا تناسب ۱/۵ کا ہے یعنی اگر ہر مسلمان صرف پانچ غیر مسلموں سے رابطے میں رہے تو اس ملک کا نقشہ چند سالوں میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ عیسائیوں نے کیسے اور کتنی محنت سے تبلیغ کر کے مختلف ریاستوں کا نقشہ تبدیل کر دیا ہے۔

اگر ہم سب بھی اسی محنت، لگن اور جذبہ سے اپنے خطابات میں دعوت پر ابھاریں تو اس ملک کا نقشہ بدل جائے گا۔ نبیؐ نے اس دعوت کو عام کیا اور ہم نے اس کو چھپا کر رکھا ہے۔ اس دیار کو ترقی دینے میں جامعہ کا اہم رول رہا ہے جن میں ذمہ داران جامعہ، معلمین ومعلمات سب شامل ہیں۔ جنوبی ہند میں اس طرز کے بہت سے ادارے قائم ہو رہے ہیں اور وہ ادارے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کام کر رہے ہیں۔

اس ادارہ کو تحریک نے بنایا اور سنوارا ہے اس لیے دعوت سے کسی کو اختلاف نہیں ہوگا، اس دعوت سے ہم اس خطہ میں ایک تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اس لیے ہم اپنے طلبہ وطالبات کو اس کام کے لیے تیار کریں۔

جناب مجتبٰی فاروق نے اپنے خصوصی خطاب میں فرمایا کہ جن لوگوں کے پاس ریسرچ کی صلاحیت

نہیں ہوتی وہ کچھ دریافت نہیں کر سکتے۔ علامہ ابن قیم جوزی نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ علم وہ نہیں جو لکھا گیا ہے علم وہ ہے جو دریافت کیا جاتا ہے۔ آج عربوں کے پاس دولت اور ہر چیز ہے لیکن امریکہ دریافت کرتا ہے۔ اسی طرح عراق اور دوسرے ممالک ہلاک ہورہے ہیں اور ہم بے بس ہیں۔ ہندوستان ہمارا ملک ہے اور ہم اس میں کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ پونہ میں محسن نامی شخص کو ہلاک کیا گیا۔ مارنے والے لڑکے بڑے مجرم نہیں تھے لیکن ہمارے خلاف غصہ نے ایسا حملہ کرادیا اور یہ نفرت دلوں میں بھر دی گئی ہے اس کو کون ختم کرے گا؟ اس ملک میں بہت سی ذاتیں اور زبانیں ہیں اور ان کے اعتقادات ونظریات مختلف النوع ہیں اتنے تضادات کے باوجود مذہب کے نام پر سب ایک ہو گئے۔ مدعو کے تضادات پر ہماری گہری نظر ہو۔ اور اس پر تجزیہ وازالہ بھی ہم ہی کو کرنا ہے۔ اس لیے ہمیں بہت ہی منصوبہ بند طریقہ سے محنت اور تیاری کی ضرورت ہے۔ کلمۂ تشکر مولانا محمد عمران فلاحی صاحب نے پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ جامعہ میں زیر تعلیم ۹۸ فیصد طلبہ وطالبات وہ ہیں جن کے گھر کے افراد جماعت اسلامی سے منسلک ہیں، اس لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسے عظیم فریضہ کو انجام دیں اور طلبہ وطالبات کے اندر تحریک پیدا کریں۔

ناظم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی نے: ''وَمَنْ أَرَادَ الآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُوراً'' کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم اخلاص کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیں اور خود بھی اپنی معلومات میں اضافہ کریں اور اپنے علم پر عمل بھی کریں۔ مولانا کی دعا سے پروگرام کا اختتام ہوا۔

اس پروگرام میں جامعہ کے جملہ اساتذہ کرام نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض مولانا رئیس احمد فلاحی صاحب (استاد شعبۂ اعلیٰ) نے انجام دیے۔

'مشرقی علوم اور کلاسی فیکیشن' کا رسم اجرا

۲۴؍ جنوری ۲۰۲۱ء بروز یکشنبہ جامعہ کی مرکزی لائبریری میں مولانا عبدالرحمٰن خالد فلاحی سابق لائبریرین جامعۃ الفلاح کی تصنیف مشرقی علوم اور کلاسی فیکیشن کا اجرا دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے معاون ڈائرکٹر عمیر الصدیق ندوی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

نشست کا آغاز قاری محمد شاہد مفتاحی صاحب (کارکن مرکزی لائبریری) کی تلاوت قرآن سے ہوا۔ مولانا ذکی الرحمٰن غازی فلاحی مدنی صاحب نے افتتاحی کلمات میں کتاب کی اہمیت وافادیت اور مشرقی علوم کی تاریخ پیش کرتے ہوئے مصنف کوکلمۂ تہنیت سے نوازا۔

اس موقع پر مولانا عمیر الصدیق ندوی نے خصوصی خطاب میں فرمایا کہ مولانا عبدالرحمٰن خالد فلاحی نے اس کتاب میں اپنے اڑتیس (۳۸) برسوں کے تجربے کا نچوڑ پیش کردیا ہے۔اس کتاب نے یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ یونی ورسٹیوں سے بی لب اور ایم لب کرنے والے مدارس کے فارغین کسی طرح سے کم نہیں ہیں۔مشرقی علوم کی درجہ بندی کے میدان میں یہ آغاز ہے۔آج کے اس دور میں جہاں اردو تصنیفات عموماً سیر وسیاحت، شعر وشاعری اور زندوں ومردوں کی سوانح حیات تک محدود ہوکر رہ گئی ہے یہ کتاب مشرقی علوم اور کلاسی فیکیشن اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔اردو زبان میں لائبریری سائنس پر ویسے بہت کام ہوا لیکن علوم دینیہ کیے لیے اندازہ ہے کہ کلاسی فیکیشن کی طرف تو سرے سے توجہ نہیں دی گئی۔مولانا عبدالرحمٰن فلاحی کی تصنیف دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔

مولانا انیس احمد مدنی (نائب مہتمم) نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب مشرقی علوم اور کلاسی فیکیشن ایک اہم اضافہ ہے۔کیوں کہ لائبریری سائنس کے میدان میں عموماً ڈی وی کو اعشاریہ کا طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ اس نے جہاں عیسائیت سے متعلق علوم کو کئی نمبر دیے وہیں دینی تصنیفات کو محض واحد ۲۹۷ نمبر دیا۔جو اسلام جیسے وسیع موضوع کے ساتھ تو سراسر ناانصافی ہے۔مذکورہ کتاب نے اسلام سے متعلق علوم کی تفصیلی کلاسی فیکیشن کی ہے، جو اسلام اور مشرقی علوم کے تمام شعبہ جات کا احاطہ کرتی ہے۔

ناظم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی نے صدارتی خطاب میں اس اہم کام کو ایک انقلابی قدم قرار دیا۔ناظم جامعہ نے مزید یہ بھی فرمایا کہ جامعہ کی لائبریری جس کا آغاز محض چند سو کتابوں سے ہوا تھا۔اس وقت اس لائبریری میں چوہتر ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔اس کی توسیع وترتیب بھی مولانا عبدالرحمٰن خالد فلاحی صاحب نے کی۔اس دوران اسلامی علوم وفنون کے کتابوں کی درجہ بندی میں مشکلات کا حل بھی انہوں نے نکالا۔یہ کتاب اس کا بہترین مظہر ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے پروگرام میں آن لائن شرکت کرتے ہوئے اپنے خطاب میں زمانۂ قدیم میں کتابوں کے تحفظ کا حوالہ دیتے ہوئے دورجدید تک کے کتب خانوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔انہوں نے مولانا عبدالرحمٰن خالد فلاحی صاحب کی کتاب کو اپنے موضوع پر ایک نادر کتاب قرار دیا اورقومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مطبوعات میں ایک اہم اضافہ بتایا۔

آخر میں مولانا اظہار احمد فلاحی مدنی (معاون ناظم جامعۃ الفلاح) کی دعا پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

قومی پرچم کشائی

۲۶/جنوری کو ناظم جامعہ کے بدست قومی پرچم کشائی کے بعد قاری اقبال احمد اصلاحی کی تلاوت قرآن سے پروگرام کا آغاز ہوا۔محمد عمر متعلم عربی اول اوران کے ساتھی نے ترانہ ملی پیش کیا۔

مولانا عبدالرحمٰن ندوی (استاد شعبۂ اعلیٰ) نے اپنے خطاب میں ہندوستان کی مختصر تاریخ اور علما کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان کا آئین سیکولر تھا اس میں تبدیلیاں کی جارہی ہیں ہم اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں۔

معاون صدر مدرس مولانا عبدالعظیم فلاحی صاحب نے فرمایا کہ آج یوم جمہوریہ ہے۔ ۲۶/جنوری ۱۹۵۰ء کو ملک کا دستور نافذ ہوا۔ جمہوریت کی تعریف کے بعد فرمایا کہ حقیقی جمہوریت میں اکثریت کا غلبہ ہوتا ہے اور اقلیت کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ انسانی نظام ہے۔اس میں زنا شراب جیسی چیزوں کے جواز کے قوانین بن رہے ہیں۔ یہ اس نظام کی خامی ہے۔اب ہماری ذمہ داری ہے کہ اسلامی تعلیمات کو مثبت انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ اس ملک میں امن وشانتی اسلام ہی سے ملے گا۔ہمیں اس ملک کے باشندگان تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہوگا۔

مولانا صباح الدین ملک فلاحی قاسمی (استاد شعبۂ اعلیٰ) نے فرمایا کہ اس ملک میں ہمیشہ سے مسلمان رہے ہیں اور بادشاہت بھی ایک عرصہ تک رہی پھراس کا خاتمہ ہوا۔ یہ دستور دنیا کا سب سے بہترین دستور ہے۔ جمہوریت کی دریافت ایک بڑی دریافت ہے۔اگر جمہوریت نہ ہوتی تو پھر ایک انسان کا نظام چلتا۔ جمہوریت ہمارے لیے ایک نعمت ہے۔اس لیے جب ہم جمہوریت پر تنقید کریں تو علمی انداز میں تنقید کریں۔

ناظم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی نے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ ۲۶/جنوری کی تاریخ ایک اہم تاریخ ہے۔اس کا ایک پس منظر ہے۔وہ یہ کہ جنوری کا آخری اتوار متعین ہوا تھا اور اس دن تاریخ ۲۶ تھی، اس لیے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے آئین کا نفاذ ہوا۔ پھر آپ نے دستور ہند کی کچھ ابتدائی باتیں اور تمہیدیں پڑھ کر سنائیں۔صحیح معنی میں جو جمہوریت ہے مولانا مودودی اسی جمہوریت کے خواہش مند تھے، اسی لیے مولانا مودودی اسلامی جمہوریت کا خواب دیکھ رہے تھے۔دستور ہند اور اسلامی دستور میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ہمارا اصل دستور قرآن ہے۔اس لیے ہم دنیا کے چاہے جس کونے میں رہیں امت مسلمہ کے پیغام کو یاد رکھیں اور اسلام کے پیغام کو پوری دنیا میں پہنچائیں اور اپنے بچوں کی صحیح نہج پر تربیت کریں۔

مولانا اخلاق احمد کریمی قاسمی ندوی (استاد شعبۂ اعلیٰ) نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔اس پروگرام میں اساتذہ وطلبہ نے شرکت کی۔

تعطیل سرما منسوخ

جامعہ کے تعلیمی کیلنڈر کے مطابق اس سال ماہ جنوری ۲۰۲۱ء میں تعطیل سرما ہونا طے تھی لیکن لاک ڈاؤن کی وجہ سے تعلیم دیر سے شروع ہوئی اس لیے اس سال تعطیل سرما منسوخ کردی گئی اور ماہ جنوری ۲۰۲۱ء میں تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔

جامعہ میں سالانہ امتحان کا اعلان

ماہ اگست ۲۰۲۰ء سے جامعہ میں آن لائن تعلیم کا آغاز ہوا اور ماہ نومبر ۲۰۲۰ء سے آن لائن کے ساتھ ساتھ آف لائن تعلیم بھی شروع ہوئی۔قرب وجوار کے طلبہ وطالبات آف لائن تعلیم سے مستفید ہورہے ہیں۔ جامعہ میں سالانہ امتحان کا اعلان کردیا گیا ہے۔ان شاء اللہ ۲۱/مارچ تا ۳/اپریل ۲۰۲۱ء جامعہ میں سالانہ امتحان منعقد ہوگا اور تعطیل کلاں کا آغاز ۲۶/شعبان سے ہوگا۔سالانہ امتحان کی تیاری اور اس سے متعلق کارروائی کے لیے جملہ طلبہ وطالبات کو ماہ فروری ۲۰۲۱ء کے وسط میں جامعہ حاضر ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔

With best compliments from

ADHAM ALI

Managing Director

+91-9821 03 2562

Swaidan

MANPOWER CONSULTANTS

Regn. No. B0513/MUM/PER/1000+/10/8522/2009

Real Tech Park, 1013, 10th Floor, Sector 30/A
Near Vashi Railway Station, Vashi
New Mumbai-400703 (India)
Tel: +91-22-66441600, Fax: +91-22-66441688
E-mail: admin@swaidan.in
Website: www.swaidan.in

JARIDA HAYAT-E-NAU
February - 2021
RNI No: DELURD/2015/65862
Vol. VI Issue - II

ادارۂ علمیہ جامعۃ الفلاح کی مطبوعات

نام کتاب	مصنف/مرتب/مترجم	صفحات	قیمت
طوفان آرہا ہے......رجوع الی اللہ-یا-تباہی	تحریر: ڈاکٹر مجدی الہلالی ترجمہ: مسیح الزماں فلاحی ندوی	۱۱۲	45
عصرِ حاضر میں علامہ شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار کی معنویت (مجموعۂ مقالاتِ سیمینار منعقدہ ۲۴،۲۵/ اکتوبر ۲۰۱۴ء)	مرتبین: عبیداللہ طاہر فلاحی مدنی، ذکی الرحمٰن غازی فلاحی مدنی	۲۸۶	300
عورت تہذیب کے دوراہے پر	مولانا محمد ایوب اصلاحیؒ	۱۰۴	45
فارغاتِ جامعۃ الفلاح کی خدمات	ترتیب وتدوین: آسیہ فلاحی	۱۰۴	80
فتح اور غلبے کا قرآنی تصور (تین حصے) مصنف: ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی	مترجم حصہ اول: مسیح الزماں فلاحی ندوی مترجم حصہ دوم: مسیح الزماں فلاحی ندوی مترجم حصہ سوم: ذکی الرحمٰن غازی فلاحی	۲۵۶ ۲۷۵ ۳۸۴	100 120 200
فقہ المیزان: فہمِ کتاب وسنت کا معیار	تحریر: ڈاکٹر علی محیی الدین قرہ داغی ترجمہ: ذکی الرحمٰن غازی مدنی	۵۸۴	525
لمعاتِ قرآنی (تفہیم وتحقیقِ قرآن پر مضامین کا مجموعہ)	ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی	۲۸۸	180
مدارسِ اسلامیہ کی دینی ودعوتی خدمات	ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی	۱۳۲	70
ملک وملت کی تعمیر اور دینی مدارس (مجموعۂ مقالاتِ سیمینار منعقدہ ۲۹،۳۰/ اکتوبر ۱۹۹۲ء)		۳۰۹	75
نصرت اور غلبے کی بشارت کس کے لیے؟	تحریر: ڈاکٹر مجدی الہلالی ترجمہ: مسیح الزماں فلاحی ندوی	۱۹۲	100
نقوش وتاثرات	مولانا جلیل احسن ندویؒ	۷۰	20
مجموعۂ مقالاتِ سیمینار ''تعلق بالقرآن-اہمیت اور تقاضے'' (منعقدہ یکم تا ۳/ اپریل ۲۰۱۱ء)	ترتیب: انیس احمد فلاحی مدنی	۵۰۰	250
یادگار مجلّہ سیمینار ''تعلق بالقرآن-اہمیت اور تقاضے'' (منعقدہ یکم تا ۳/ اپریل ۲۰۱۱ء)	ترتیب: انیس احمد فلاحی مدنی	۴۴۲	200
یادگار مجلّہ ''عصرِ حاضر کے چیلنجز اور خواتین'' (بموقع اجتماعِ خواتین منعقدہ یکم تا ۳/ مارچ ۲۰۱۶ء)	مدیر مسئول: سلمیٰ جلیل صالحاتی مدیر تحریر: آسیہ فلاحی	۳۲۰	200

1- ادارہ علمیہ، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی، پن کوڈ: 276121، موبائل نمبر: 8181802562

2- مدھر سندیش سنگم، E-20، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، پن کوڈ: 110025، موبائل نمبر: 9212117559